تحقیقی مقالہ برائے بی۔ایس اُردو

جدید کینیڈین اُردو افسانہ نگار

سیشن ۲۰۱۹ء تا ۲۰۲۳ء

مقالہ نگار

محمد ارسلان

کالج رول نمبر ۱۹۷۱۰

پنجاب یونیورسٹی رول نمبر ۰۳۶۹۸۲

پنجاب یونیورسٹی رجسٹریشن نمبر ۷۲۹-mo -۲۰۱۹

نگران مقالہ

ڈاکٹر عاطف خالد بٹ

اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)

گورنمنٹ ایم اے او گریجویٹ کالج لاہور

تصدیق نامہ

مقالہ بہ عنوان **"جدید کینیڈین اُردو افسانہ نگار"**

مقالہ نگار: **محمد ارسلان** رجسٹریشن نمبر ۲۰۱۹-mo-۷۲۹

یہ تحقیقی مقالہ یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور کی مقالہ کمیٹی میں بی ایس اُردو کی ڈگری کے تقاضوں کی جزوی تکمیل کے طور پر منظور کیا گیا ہے۔

مقالے کی امتحانی کمیٹی:

۱۔ داخلی ممتحن نام ---------- دستخط ----------

۲۔ صدرِ شعبہ اُردو نام ---------- دستخط ----------

۳۔ کنٹرولر امتحانات نام ---------- دستخط ----------

۴۔ خارجی ممتحن نام ---------- دستخط ----------

تاریخ------------

اقرار نامہ

میں محمد ارسلان ولد غلام رسول بی ایس اُردو (رجسٹریشن نمبر ۲۹-۷-mo-۲۰۱۹)

حلفیہ طور پر اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ زیرِ عنوان:

”جدید کینیڈین اُردو افسانہ نگار“

میں پیش کیا جانے والا مواد میری ذاتی کاوش پر مبنی ہے اور یہ کام سوائے یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور کے پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی ادارے یا یونیورسٹی میں کسی نوع کی ڈگری کے حصول کے لیے نہ تو پیش کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی تحقیقی ادارے کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

تاریخ: ______________ دستخط مقالہ نگار

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیرِ نظر مقالہ بہ عنوان:

"جدید کینیڈین اُردو افسانہ نگار"

محمد ارسلان رجسٹریشن نمبر ۷۲۹-mo-۲۰۱۹ نے بی ایس اُردو کی ڈگری کے حصول کے لیے میری زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ مزید برآں اس موضوع پر پہلے سے کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا اور یہ خالصتاً نئی تحقیق ہے۔

نگران مقالہ

ڈاکٹر عاطف خالد بٹ

اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)

تاریخ: ______________

انتساب

جان سے بڑھ کر عزیز والدین

اور

مرحوم بھائی محمد کامران کے نام

پیش لفظ

بی ایس اُردو کے ساتویں سمسٹر میں ہمیں شعبہ اُردو کی جانب سے تحقیقی مقالہ لکھنے کی ہدایات ملیں۔ میرے لیے اس سطح کے تحقیقی کام کا پہلا تجربہ تھا اور تجسس بھی تھا کہ یہ کام کس قدر اہم اور مشکل ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا کہ ہم نے یہ تحقیقی کام آٹھویں سمسٹر کے امتحان سے پہلے مکمل کرنا تھا۔ تحقیقی مقالے کے لیے سب سے پہلا مرحلہ موضوع کا انتخاب تھا جس میں کافی دشواری پیش آئی۔ میری دلچسپی افسانہ نگاری کی طرف تھی اور اساتذہ کرام سے مشاورت کی تو انھوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی اور مفید مشورے دیے۔

افسانہ نگاری کے حوالے سے موضوعات کی کثیر تعداد موجود تھی لیکن میں نے بیرونِ ممالک خاص طور پر کینیڈا میں موجود دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں پر کام کرنا مناسب سمجھا کیونکہ یہ لوگ اردو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ ہیں جو اُردو زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں اب کینیڈا میں موجود پاکستانی اردو افسانہ نگاروں کی تعداد کا تعین بہت مشکل تھا لہٰذا میں نے محترم جناب ڈاکٹر خالد سہیل سے پہلے بذریعہ ای میل اور پھر واٹس ایپ پر رابطہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کچھ نام بتائے اور میں نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس تعاون کے لیے میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں۔ وقت کی قلت کے باعث میں نے صرف چار لوگوں کا انتخاب کیا جن میں ڈاکٹر خالد سہیل، سیّد حامد یزدانی، ڈاکٹر بلند اقبال اور محترمہ روبینہ فیصل شامل ہیں۔

بالآخر میں نے استاد محترم جناب ڈاکٹر عاطف خالد بٹ کی بے لوث شفقت اور مشاورت سے موضوع کا انتخاب کر لیا۔ مقالے کا موضوع میں نے ''جدید کینیڈین اردو افسانہ نگار'' رکھا ہے۔ مقالے کو چھے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں پہلا باب اُردو افسانے کی روایت پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب مغربی ممالک میں اُردو زبان کے متعلق ہے۔ تیسرا باب ڈاکٹر خالد سہیل کی شخصیت اور فن اور ان کا افسانوی مجموعہ ''دیوتا'' کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ چوتھے باب میں سیّد حامد یزدانی کی شخصیت اور فن اور ان کے افسانوی مجموعے ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں ڈاکٹر بلند اقبال کی شخصیت اور فن اور ان کے دو افسانوی مجموعے ''فرشتے کے آنسو'' اور ''میری اکیاون کہانیاں'' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں محترمہ روبینہ فیصل کی شخصیت اور فن اور ان کے دو افسانوی مجموعے ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' اور ''گمشدہ سائے'' کا تجزیاتی مطالعہ بیان کیا گیا ہے۔

آخر میں مجھے ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی دعائیں اور محبتیں شاملِ حال رہیں اور یہ کام عافیت سے تکمیل کو پہنچا۔ سب سے پہلے خدائے ذوالجلال کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے اس قابل بنایا اور قلم کے ذریعے مجھے وہ کچھ سکھایا جو میں نہیں جانتا تھا اور اللہ کے پیارے حبیب، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں جو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔

میں اپنے والدین اور بڑے بھائی محمد عمران خالد کا بے حد شکر گزار ہوں جو میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ جن کی وجہ سے میری زندگی کے تمام رنگ ہیں۔ ان کی محبتیں اور دعائیں ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کا سایہ تادیر برقرار رکھے۔ آمین

یہ بات سچ ہے کہ کوئی بھی کام بغیر معلم کے پائیہ تکمیل تک پہنچانا قریباً ناممکن ہے اس لیے میں اپنے معزز و مکرم اُستاد جناب عاطف خالد بٹ کا بے حد ممنون ہوں جن کی رہنمائی سے یہ کام تکمیل کو پہنچا۔

میں اپنے انتہائی شفیق اُستاد محترم صدر شعبہ اُردو جناب آصف علی چٹھہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر وقت ہماری رہنمائی فرمائی اور ہمارے سر پر دستِ شفقت بنائے رکھا۔ میں کوارڈینیٹر بی ایس اُردو پروفیسر ڈاکٹر محمد طارق صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کورس کے آغاز سے اب تک ہماری تمام نصابی سرگرمیوں میں ہر ممکن مدد فرمائی اور ہمارے ہر قسم کے مسائل کے حل کے لیے پیش پیش رہے۔ آپ کے علاوہ شعبہ اُردو کی دیگر عظیم ہستیاں جن کا میں ممنونِ احسان ہوں ان معتبر ناموں میں ڈاکٹر ساجد صدیق نظامی، ڈاکٹر طارق کلیم صاحب، میڈم شہزادی پروین صاحبہ، شفقت رسول مرزا صاحب، سر داؤد حسین صاحب اور سر وقاص احمد شہباز صاحب شامل ہیں۔

مجھے اپنے دیگر تمام اساتذہ اور ہم جماعت ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن سے اس کورس ورک کے دوران بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور بالخصوص اپنے دوستوں میں اسد افتخار، محمد وراد، محمد سالار، اُسامہ اور بدر ہاشمی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی اور فراہم کردہ معلومات اس مقالے کے لیے کارگر ثابت ہوئیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک تمام اساتذہ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ برقرار رکھے اور ان سے فیض یاب ہونے کا شرف بار بار نصیب فرمائے۔ آمین، یارب العالمین۔

محمد ارسلان

فہرست

عنوان		صفحہ نمبر
پیش لفظ		
باب اوّل	اُردو افسانے کی روایت	۱
باب دوم	مغربی ممالک میں اُردو زبان	۱۱
	کینیڈا میں اُردو	۱۴
باب سوم	ڈاکٹر خالد سہیل: شخصیت اور فن	۱۷
	افسانوی مجموعہ ''دیوتا'' کا تجزیاتی مطالعہ	۲۴
باب چہارم	سیّد حامد یزدانی: شخصیت اور فن	۲۸
	افسانوی مجموعہ ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' کا تجزیاتی مطالعہ	۳۲
باب پنجم	ڈاکٹر بلند اقبال: شخصیت اور فن	۳۸
	(ا) افسانوی مجموعہ ''فرشتے کے آنسو'' کا تجزیاتی مطالعہ	۴۲
	(ب) افسانوی مجموعہ ''میری اکیاون کہانیاں'' کا تجزیاتی مطالعہ	۴۶
باب ششم	روبینہ فیصل: شخصیت اور فن	۵۱
	(ا) افسانوی مجموعہ ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' کا تجزیاتی مطالعہ	۵۴
	(ب) افسانوی مجموعہ ''گمشدہ سائے'' کا تجزیاتی مطالعہ	۵۵
کتابیات		۶۰تا۶۲

بابِ اوّل

اُردو افسانے کی روایت

تعارف:

افسانہ ایک ایسی مختصر تحریر کا نام ہے جس میں کسی واقعے، کردار یا لمحے کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔اردو زبان میں افسانہ انگریزی ادب کے ''Short Story'' سے آیا۔ مغربی زبانوں میں افسانے سے پہلے طویل قصے کہانیاں اور ناول لکھنے کا رواج تھا مگر جوں جوں انسان عدیم الفرصت ہوتا گیا تو کسی ایسی صنفِ ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھنے والے کو مسرت اور تسکین کے لمحات میسر کر سکے، چنانچہ اُردو افسانہ لکھا جانے لگا۔ڈاکٹر شفیق انجم اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''نئے دور میں زندگی کی برق رفتاری مختصر افسانے کے آغاز کا محرک بنی۔ مغرب میں صنعتی انقلاب اٹھارھویں صدی عیسوی میں آیا۔ برصغیر میں اس کے اثرات انیسویں صدی میں وارد ہوئے اور بیسویں صدی میں عروج پر پہنچے۔ معاشی الجھنوں اور ترقی کے مادی نظریے کی بدولت فرصت کے لمحات رفتہ رفتہ سمٹنے لگے۔سیاسی و سماجی الٹ پھیر نے مسائل کا دائرہ وسیع کر دیا اور زندگی کی گہما گہمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس صورتحال میں طویل قصوں کی بجائے ایسی کہانیوں کی ضرورت تھی جو مکمل بھی ہوں اور کم سے کم وقت میں ذوق جمال کی تسکین کا باعث بنیں۔وقت کی ایسی ضرورت کو مختصر افسانے نے پورا کیا۔یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی میں اس صنف کو عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہو گئی۔''(۱)

عطاءالرحمٰن نوری افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''افسانہ قصہ کی وہ شکل ہے جس کے لیے انگریزی میں '' شارٹ اسٹوری''کا نام استعمال ہوتا ہے۔اب اس کے لیے ''فکشن''کا لفظ مستعمل ہے۔یہ داستان اور ناول کی ارتقائی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔بے شمار تعریفوں کے سبب افسانے کی کوئی ایک مخصوص تعریف بے حد مشکل ہے۔عام طور پر فرضی کہانی کو افسانہ کہا جاتا ہے جو حقیقت کے قریب ہو اور زندگی کی اساس ہو۔۔۔۔''(۲)

افسانے کی ابھی تک کوئی حتمی تعریف نہیں کی جاسکتی کیوں کہ ناقدین کی اس حوالے سے مختلف آراء ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق:

"یہ ایک معروف صنف ہے جس کی تکنیک یا مختلف اقسام کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں اس میں اکثر ایک واقعہ (Episode) کا بیان ہوتا ہے جبکہ ناول میں کوئی تحدید نہیں۔"(۳)

سیّد وقار عظیم کے مطابق:

"افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعہ، ایک جذبہ، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ نمایاں ہو کہ پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثرانداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اُسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔ مختصر افسانہ میں اختصار اور ایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اُس کے فن میں سادگی، حسنِ ترتیب وتوازن کی صفت پیدا کی۔"(۴)

راجندر سنگھ بیدی اپنے مضمون "افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل"، میں لکھتے ہیں:

"افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بہ حیثیت فن شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے۔ پھر شعر، فی الخصوص غزل میں آپ عورت سے مخاطب ہیں، لیکن افسانے میں کوئی ایسی قباحت نہیں۔ آپ مرد سے بات کر رہے ہیں، اس لیے زبان کا اتنا رکھ رکھاؤ نہیں۔ غزل کا شعر کسی کھردرے پن کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن افسانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نثری نژاد ہونے کی وجہ سے اس میں کھردرا پن ہونا ہی چاہیے، جس سے وہ شعر سے ممیّز ہو سکے۔"(۵)

ایک اور جگہ پر افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ

"افسانہ ادب کی نثری صنف ہے۔ لغت کے اعتبار سے افسانہ جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں یہ لوک کہانی کی ہی ایک قسم ہے۔ ناول زندگی کا کل اور افسانہ

زندگی کا ایک جز پیش کرتا ہے۔ جبکہ ناول اور افسانے میں طوالت کا فرق بھی ہے اور وحدت تاثر کا بھی۔"(٦)

افسانہ کی درج بالا مختلف تعریفوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ مختصر نثری بیانیہ صنف ہے جس میں زندگی کے کسی ایک گوشہ یا کسی ایک پہلو یا کسی ایک واقعہ کو موثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے اور جو قاری کو مسرّت و انبساط کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی:

١۔ پلاٹ

٢۔ کردار نگاری

٣۔ زمان و مکان

٤۔ وحدت تائثر

٥۔ موضوع

٦۔ اسلوب

ناول کی طرح افسانے میں بھی اسلوبِ بیان، کردار نگاری اور پلاٹ بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کم از کم الفاظ کا استعمال کرے اور الفاظ سے زیادہ جذبات سے اپنی کہانی کو نمایاں کرے۔ لوگ عام طور پر الفاظ کے ذریعے نہیں سوچتے بلکہ انسان کے دل و دماغ میں خیالات اور جذبات پہلے آتے ہیں۔ تخلیق کار ان خیالات کو لفظوں کا جامہ پہنا تا ہے اور خوبصورت شکل بنا دیتا ہے۔ اس طرح افسانہ ایک خیالی پیکر کی عملی تشکیل کا نام ہے۔ یہ کسی امر کا ایسا بیان جس میں تمہید، ارتقا، عروج اور پھر اسے کسی موزوں نتیجے پر ختم کر کے نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہو یعنی افسانے میں ایک منطقی ترتیب و تنظیم ہوتی ہے۔ افسانے کے بارے میں وزیر آغا کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔ مگر کہانی محض ہوا میں تخلیق نہیں ہو جاتی۔ اس کی نقوش کو اُجاگر کرنے کے لیے سب سے پہلے ایک کینوس درکار ہو گا۔ اور یہ

کینوس زمانی اور مکانی حدود کے تابع ہو گا۔ کوئی واقعہ بہر صورت ایک جگہ اور خاص وقت ہی
میں ظہور پزیر ہو سکتا ہے۔اور اس لیے کہانی لکھنے والوں کو کینوس کے انتخاب پر خاص توجہ
کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔"(۷)

ایک اور جگہ پر افسانے کی بنت کے بارے میں ذکر ملتا ہے کہ :

"کہانی کہنے والے کی خوبی اس بات میں ہے کہ وہ کہانی کی بکھری ہوئی کڑیوں کے
درمیانی فاصلے کو ختم کر کے ان کو یوں ملائے کہ سارے خد و خال ایک ترشے ہوئے واقعہ کی
صورت میں مرتب ہو جائیں۔"(۸)

آغاز وارتقا:

افسانہ کے بارے میں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اُردو زبان میں یہ صنف مغربی ادب کی دین ہے۔اُردو میں افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہوا۔اُردو کا پہلا افسانہ راشدالخیری کا"طاہرہ اور خدیجہ" کو تسلیم کیا گیا ہے جو کہ ۱۹۰۳ء میں "مخزن" میں شائع ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب "اُردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء – ۱۹۰۹ء" کا انتساب بھی "اردو کے پہلے افسانہ نگار راشدالخیری کے نام" کے نام سے لکھا ہے۔ لیکن زیادہ تر آراء پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کو اردو افسانے کے ابتدائی نقوش پیش کرنے کے حوالے سے ملتی ہیں۔ بعض ناقدین کے مطابق سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ"، "معارف"، علی گڑھ میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "خیالستان" ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" ۱۹۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں ان کی تحریر کردہ پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" شامل تھی جو حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھی۔ جس میں انھوں نے اظہار کیا ہے کہ وطن کی آزادی میں بہنے والا خون "سب سے انمول رتن" ہے۔

۱۹۵۵ء میں پروفیسر وقار عظیم نے پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرتے ہوئے کہا:

"ہندوؤں کا زاویہ نظر خالص سیاسی تھا" مثال کے طور پر پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا
سب سے انمول رتن" اس سیاسی رجحان کا حامل ہے۔"(۹)

پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو میں انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور روس کے معیاری افسانوں کے تراجم کثرت سے شائع ہوئے، جن کا اثر اُردو افسانے پر بھی پڑا مگر جلد ہی اردو افسانہ نگاروں نے اپنی کارگاہ کو وسعت دی اور اپنی کہانیوں کو فطری اور حقیقی پلاٹوں سے منظم کیا اور اپنے گرد و پیش کی تمام زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔اس کے ساتھ ساتھ عمدہ کردار نگاری اور خوبصورت منظر نگاری سے اپنے افسانوں کو جلا بخشی اور یوں افسانے کو موئثر ترین صنفِ ادب کا درجہ حاصل ہو گیا۔ابتدائی دور کے افسانوں میں ہمیں دو رجحان نظر آتے ہیں۔

۱۔ اصلاح و حقیقت پسندی کا رجحان

۲۔ رومانیت و تخیل پرستی کا رجحان

اول الذکر رجحان کے سرخیل پریم چند ہیں۔پریم چند کے بعد اس رجحان سے متاثر ہونے والوں میں سدرشن، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی اور علی عبّاس حسینی وغیرہ کے نام ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔رومانیت و تخیّلی میلان کی قیادت سجاد حیدر یلدرم نے کی۔اس رجحان سے متاثر ہونے والوں میں نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر احمد علی جوہر اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''اردو افسانہ میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' کی اشاعت عمل میں آئی۔یہ دس افسانوں کا مجموعہ تھا۔پانچ سجاد ظہیر کے، دو رشید جہاں کے، دو احمد علی اور ایک محمود الظفر کا۔اس مجموعہ کے افسانوں میں قدیم سماج، مذہب اور اخلاقی اقدار کی دھجّیاں اُڑائی گئی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ اشاعت ہوتے ہی فوراً ضبط کر لیا گیا، مگر اس مجموعہ نے اردو افسانہ میں ترقی پسندی کی داغ بیل ڈال دی۔اردو افسانہ میں پریم چند کے ''کفن'' جیسے شاہکار افسانہ کی اشاعت نے بھی اردو افسانہ کو ایک نیا راستہ (ترقی پسندی) دکھایا۔اردو افسانہ کا سب سے سنہرا دور اس وقت آیا جب ۱۹۳۶ء میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی۔اس تحریک کے زیر اثر سب سے زیادہ صنف افسانہ کا فروغ ہوا۔کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عبّاس اور حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اس تحریک سے متاثر ہو کر اپنے افسانوں میں سماجی الجھنوں، معاشی تلخیوں اور سیاسی طور کے مختلف پہلوؤں کی بے لاگ مصوّری کی اور ایسے شاہکار افسانے تخلیق کیے کہ

اردو افسانہ کا قد انتہائی بلند نظر آنے لگا۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج ہی پر تھی کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا سانحہ پیش آیا۔ اس سے ترقی پسند تحریک کو بڑا دھچکا لگا۔ اس سانحہ (تقسیم ہند) پر بہت سے افسانے لکھے گئے جن میں بعض اچھے افسانے بھی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں بظاہر آزادی تو مل گئی لیکن تقسیم ہند کے واقعہ نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا۔ اب آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو گئی اور ۶۰۔۱۹۵۵ء کے آس پاس جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہوا۔ اس رجحان کے زیر اثر علامتی، تمثیلی اور تجریدی کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ اس رجحان کے زیر اثر صنف افسانہ کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا۔ اس رجحان کے زیر اثر دو طرح کے لکھنے والے تھے۔ ایک شدّت پسند جدید افسانہ نگار اور دوسرے غیر شدّت پسند یا جدید ترقی پسند افسانہ نگار۔ اوّل الذکر صف میں انور سجّاد، بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور عظیم اور رشید امجد اور اس جیسے افسانہ نگار آتے ہیں اور ثانی الذکر صف میں رام لعل، اقبال متین، رتن سنگھ، قاضی عبدالستار، اقبال مجید اور اس طرح کے افسانہ نگاروں کا شمار ہوتا ہے۔ ۸۰۔۱۹۷۵ء تک آتے آتے جدیدیت کا رجحان بھی زوال پذیر ہوا اور ادب میں مابعد جدیدیت ایک رجحان کے طور پر سامنے آئی۔ اب ۱۹۸۰ء کے بعد کہانی میں پھر سے افسانوی لوازم پلاٹ، کردار، مکالمہ، کہانی پن اور جُزئیات وغیرہ پہ بہ طور خاص توجّہ دی جانے لگی اور نئے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کو موضوع بنا کر کہانیاں لکھی جانے لگیں اور کہانیوں میں سماج کی بھرپور عکّاسی کی جانے لگی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے تا حال جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو نئی جہات سے ہمکنار کرنے اور اس کے ارتقا میں نمایاں حصّہ لیا ہے، ان میں سلام بن رزّاق، ساجد رشید، حسین الحق، شفق، عبدالصمد، علی امام نقوی، حمید سہروردی، بیگ احساس، ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، ثروت خاں، شائستہ فاخری، شموئل احمد، شوکت حیات، شفیع جاوید، طارق چھتاری، معین الدین جینا بڑے، پیغام آفاقی اور مشرف عالم ذوقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنی افسانوی تحریروں سے اردو افسانہ کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور بعض اب بھی دے رہے ہیں۔ صنفِ افسانہ کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس کی موجودہ صورت حال کو دیکھ کر یہ کہنا بجا ہوگا کہ صنفِ افسانہ اردو نثر کی آبرو ہے۔"(۱۰)

آزادی کے بعد ملک کو جن نئے نئے حالات و مسائل سے دوچار ہونا پڑا انھوں نے لوگوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے، چنانچہ افسانے کے موضوعات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

"آزادی کے بعد اردو افسانے میں عمرانی شعور پیدا ہوا ہے۔ اس سے قبل کے افسانوں میں ہمیں زندگی کا احساس تو ملتا ہے ادراک نہیں ملتا۔ ہمارے افسانہ نگار سماجی تربیت اور ماحول کی تلخی اور چبھن کو محسوس تو کر رہے تھے لیکن سنجیدگی سے نہیں۔ اس پر غور کرنے کے بجائے ایک رومانوی بے توجہی برتی جارہی تھی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ آزادی سے پہلے کا ہیرو عام طور پر ایک افسردہ مزاج خواب پرست نوجوان ہوتا تھا۔ جس کے آدرش حسین تابناک اور زندگی بخش ہیں لیکن وہ پرمیتھیور کی طرح حقیقت کے سنگین کوہساروں سے بندھا ہوا ہے۔ اکا دکا افسانے اپنی زمین سے قریب سماجی زندگی کے آہنگ کو تلاش کرتے رہے۔ جب تک "رحمان کے جوتے"، "گرہن"، "واپسی"، "آخری کوشش"، "ہیروشیما کے پہلے"، "ہیروشیما کے بعد" اور "زندگی کے موڑ پر" کا نام ہمارے افسانوی ادب میں زندہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" (۱۱)

آزادی کے بعد سے لے کر زمانہ حال تک افسانہ لکھنے والوں میں بڑے بڑے نام قرۃ العین حیدر، غلام عباس، انتظار حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، غلام ثقلین نقوی، سعادت حسن منٹو، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے وغیرہ شامل ہیں۔

اگر ہم موجودہ صدی میں افسانے کی بات کریں تو جس طرح جدید ٹیکنالوجی، سوشل میڈیا، انٹرنیٹ اور نئی نئی ایجادات نے دنیا کو ایک گاؤں یا گھر کی طرح بدل دیا ہے، جس سے لوگوں میں آگاہی سے مواقع بہت حد تک بڑھ گئے ہیں اور زندگی میں آسانیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن نئے دور میں نئے نئے مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔ یہ مسائل انسانی زندگی پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں اور ان کا اثر افسانہ نگاروں پر بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگاران مسائل کو اپنا موضوع بنا رہے ہیں۔ موجودہ دور میں تقریباً زندگی کے ہر پہلو کو افسانے کا موضوع بنایا جا رہا ہے اور اس میں مزید وسعت آرہی ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم افسانوں کے بدلتے ہوئے رنگ کے متعلق رقم طراز ہیں:

"آج کے افسانہ میں احساس ہوتا ہے کہ انسان کی کھوکھلی شخصیت جو محض نمائشی کروفر کی چیز بن گئی ہے، برق رفتار دور میں داخل ہو کر اور بھی پُراسرار بن گئی ہے۔ تشنہ آرزوؤں

، نفسانی خواہشوں اور جنسی بے راہ روی نے اخلاقی پستی کے کچھ اور بھی دروازے کھول دیے ہیں۔ شہری زندگی میں کاہلی، بے کاری، فاقہ مستی، بد دیانتی، بے سروسامانی اور رشوت ستانی نے ذہن اور ضمیر کی رسہ کشی کو تیز کر دیا ہے۔ محدود ذرائع آمدنی سے شکوک میں اضافہ ہوا تو بے نیازی، بے اعتباری اور بے وفائی کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ کرب و یاس کے اس ماحول نے عوام کو ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے، جس کی بنا پر اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ فن بھی بدلا ہے اور مطمح نظر کے زاویے بھی تبدیل ہوئے ہیں۔"(۱۲)

حواشی

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء)، ۳۹۔

۲۔ عطاء الرحمٰن نوری، اردو اصناف ادب (مہاراشٹر: رحمانی پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ۴۸۔

۳۔ گیان چند، ڈاکٹر، ادبی اصناف (گجرات: اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء)، ۱۲۹۔

۴۔ لطیف الدین احمد ساقی، فن مختصر افسانہ (لاہور: سالنامہ، ۱۹۳۸ء)، ۲۸۔

۵۔ راجندر سنگھ بیدی، افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل، مشمولہ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ، گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء)، ۳۱۔

۶۔ وکیپیڈیا، "افسانہ،"

https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%A7%D9%81%D8%B3%D8%A7%D9%86%DB%81

۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو افسانہ روایت و مسائل (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء)، ۱۱۵۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔

۹۔ حامد بیگ، مرزا، اُردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء – ۱۹۰۹ء (دہلی: عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمٹیڈ، ۲۰۱۴ء)، ۳۳۔

۱۰۔ ڈاکٹر احمد علی جوہر، "صنف افسانہ اور اس کا آغاز وارتقاء،"

https://adbimiras.com/sinf-e-afsana-aur-uska-aaghaz-wa-irteqa-dr-ahmad-ali-jauhar/

۱۱۔ فرمان فتح پوری، اردو نثر کا فنی ارتقا (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ۲۲۔

۱۲۔ طفیل احمد، "اکیسویں صدی میں اردو فسانہ" اردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۲۶ (اپریل-جون ۲۰۲۱ء): ۱۷۴۔

باب دوم

مغربی ممالک میں اُردو زبان

اور

کینیڈا میں اُردو

مغربی ممالک میں اُردو زبان

اردو ایک زندہ زبان ہے اور یہ مستقبل میں بھی زندہ رہے اس سلسلے میں نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے کم و بیش پچاس ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو زبان بولنے والے نہ صرف اسے بولنے تک محدود رکھتے ہیں بلکہ ادبی اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اس طرح اُردو ادب ایک مقبول اور بااثر ادب کے طور پر لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ادب دراصل ذاتی تجربات اور اور احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کا اہم ذریعہ ہے۔ ادب کا زندگی کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ ہے، کہ یہ اس کا آئینہ بھی ہے اور اس کی شناخت بھی، مطلب ادب آپ کو زندگی کی تصویر دکھاتا ہے تو اس زندگی کو بہتر بنانے کی تدبیر بھی بتاتا ہے۔ اسی لئے ادب کا فروغ، ذہنی اور دماغی قوتوں کا فروغ ہے اور قوموں کی ترقی اسی میں پوشیدہ ہے۔ ادب کسی بھی زبان میں ہو اور اس کی کوئی بھی صنف ہو اس کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے جیسا کہ نامور افسانہ نگار پریم چند نے اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> ”ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو، اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اس حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔“(۱)

جس طرح ارسطو نے کہا تھا کہ

> ”روح تین سطحوں پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ پہلی سطح نباتات کی ہے، جہاں محسوس کرنے کا عمل ہی اس کا نمایاں ترین ثبوت ہے۔ دوسری سطح حشرات الارض کی ہے جہاں محسوس کرنے کے علاوہ حرکت کرنے کا عمل ایک اضافی وصف کے طور پر موجود ہے۔ تیسری سطح، انسان کی ہے جہاں محسوس کرنے اور حرکت کرنے کے علاوہ، سوچ بچار کا عمل بھی موجود ہے۔“(۲)

اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اس کے فروغ کے لیے نہ صرف پاکستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی مختلف یونیورسٹیوں میں اُردو کی چیئرز قائم ہیں اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے ادارے بھی اردو زبان کی ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔افتخار عارف اس حوالے سے کہتے ہیں:

''پاکستان کی قومی زبان اردو اس وقت دنیا کی چند بڑی زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق چینی اور انگریزی کے بعد ہر سطح پر سمجھی اور بولی جانے والی زبانوں میں اردو تیسری بڑی زبان شمار ہوتی ہے۔''(۳)

کینیڈا میں اُردو

اُردو زبان اپنی وسعت، قوت اور استعداد کی بنا پر ایک بین الاقوامی سطح پر رابطے کی مؤثر زبان سمجھی جاتی ہے۔اُردو زبان مختلف زبانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ ہر وقت ارتقائی منازل کو طے کرتی نظر آتی ہے۔اس زبان کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانے کا سہرا ادیبوں اور شاعروں کے سر ہے کہ وہ مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اس کے فروغ کا کام بھی کر رہے ہیں۔ کینیڈا کی زیادہ تر آبادی انگریزوں اور فرانسیسیوں پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قومیں آباد ہیں جن میں مسلمان،ہندو، سکھ وغیرہ شامل ہیں۔ روبینہ فیصل کینیڈا میں اردو ادب کے بارے میں لکھتی ہیں:

''اگر کینیڈا میں اردو ادب کی بات کریں تو اس کا سفر جاری ہے۔ رکا نہیں ہے۔ایک انسان کے ذاتی حالات اور خیالات ہوتے ہیں اور ایک جہاں وہ رہا ہوتا ہے وہاں کے اجتماعی حالات اور خیالات، ان دونوں کے ملاپ سے جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان سب کو الفاظ میں قید کرنے والا ادیب یا شاعر اگر دونوں جہانوں کا باسی ہو تو ایک منفرد ادب تشکیل پاتا ہے۔ پاکستان، انڈیا یا بنگلہ دیش میں بیٹھا کوئی ادیب کتنا ہی اچھا لکھاری کیوں نہ ہو، وہ کینیڈا کی کہانی پاکستانی کینیڈین رائٹر سے زیادہ بہتر نہیں لکھ سکے گا۔ کیونکہ ہڈ بیتی اور جگ بیتی ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں اور لکھنے کا ہنر بھی آتا ہو تو، ادبی پارہ شاہکار ہو سکتا ہے۔''(۴)

''کینیڈا میں اردو بولنے والوں کی کل آبادی اس وقت 208,125 ہے۔ اردو بولنے والی آبادی کی آمد ۱۹۶۰ء کی دہائی سے شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے دہائی میں اُردو سوسائٹی آف کینیڈا کا قیام ٹورانٹو میں ہوا۔اس سوسائٹی کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً مشاعرے منعقد ہونے ہونے لگے اور سرگرمیاں نئے ہندو پاک تارکین وطن کی آمد کے ساتھ بڑھنے لگیں۔اندازہ لگایا جارہا ہے کہ کینیڈا میں اردو بولنے والوں کی آبادی 0.5 فیصد ہے۔مانٹریال کی میکگل یونیورسٹی میں پاکستان کے تعاون سے اُردو کے ایک الگ شعبے ''Chair'' کا قیام عمل میں آچکا ہے۔''(۵)

کینیڈا کی سرزمین پر پچھلی کئی دہائیوں سے اردو ادب کی نشو و نما بہت محبت اور ذوق و شوق سے کی جارہی ہے اس سلسلے میں اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ روبینہ فیصل اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''کینیڈا میں ۱۹۶۸ء میں اردو کا پہلا رسالہ ''صہبا'' حفظ الکبیر قریشی نے نکالا تھا۔ صبیح الدین منصور کا رسالہ'' پاکیزہ ''اور مختلف رسائل جیسے کہ الہلال۔امروز،ملت،لیڈر، صحافت، سخنور،ایلومنائی انٹرنیشنل،دی ایسٹرن نیوز،آواز،وطن،آفاق، ترجمان،پارس اور ملاقات۔۔یہ سب رسائل پاکستانی مصنفین کو کینیڈا میں بسنے والے اُردو کے قاری سے جوڑنے کا باعث بنتے تھے۔''(۶)

حواشی

۱۔https://www.humsub.com.pk/339693/rubina-faisal-45/

۲۔ایضاً

۳۔افتخار عارف،’’پیش لفظ‘‘، مشمولہ، بیرونِ ممالک میں اُردو،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۶ء)،۳۔

۴۔روبینہ فیصل،’’اُردو ادب اور کینیڈا میں اُردو افسانہ،‘‘

https://www.humsub.com.pk/339693/rubina-faisal-45/#lnm2jz99rwvjjywkgs

۵۔وکیپیڈیا،’’کینیڈا میں اردو،‘‘

https://ur.wikipedia.org/wiki/%DA%A9%DB%8C%D9%86%DB%8C%DA%88%D8%A7_%D9%85%DB%8C%DA%BA_%D8%A7%D8%B1%D8%AF%D9%88

۶۔روبینہ فیصل،’’پاکستانی اور کینیڈین مصنفین کے ادبی روابط،‘‘

https://www.mukaalma.com/132216/

باب سوم

ڈاکٹر خالد سہیل: شخصیت اور فن

اور

افسانوی مجموعہ ''دیوتا'' کا تجزیاتی مطالعہ

تعارف:

ڈاکٹر خالد سہیل ۹ جولائی ۱۹۵۲ء میں کراچی میں پیدا ہوئے آپ ایک مشہور ماہر نفسیات، ناول نگار، افسانہ نگار ادیب اور شاعر ہیں۔ ڈاکٹر خالد سہیل کے والد کا نام پروفیسر عبدالباسط تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ وقت کی تیز رفتاری میں بہترین زندگی گزارنے کے لیے معاش کی تلاش میں پنجاب کے میدانی علاقے میں ہجرت کی۔ اس بات کا ثبوت ان کی اپنی تحریروں سے بھی ملتا ہے کہ ان کے خاندان کی ہجرت وادی کشمیر سے پنجاب کے میدانی علاقے کی طرف ایک نہایت مشکل مرحلہ تھا اپنی دھرتی ماں کو الوداع کہنا بہت ہی دشوار کام ہے لیکن حالات کی ستم ظرفی انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

کشمیر کے بعد ان کا پہلا پڑاؤ امرتسر کی زمین پر تھا۔ کشمیری سرزمین سے اپنے سفر کے آغاز کے بارے میں اپنے افسانے "دھرتی ماں اداس ہے" میں اپنی نانی اماں کی زبانی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"بیٹی! ہمارا خاندان بھی دریاؤں سے مختلف نہیں

ہم نے بھی کشمیر کے پہاڑوں سے اپنا سفر شروع کیا تھا

ہمارے آباؤ اجداد

انہی پہاڑوں میں بستے تھے

انہی وادیوں میں زندگی گزارتے تھے" (۱)

"۔۔۔۔کشمیر کے پہاڑوں اور وادیوں کے باسیوں نے

اپنے خیمے اٹھائے

دھرتی ماں کو الوداع کہا

وہ ہجرت اس خاندان کی پہلی ہجرت ثابت ہوئی" (۲)

پہلی ہجرت کے بعد ان کا پڑاؤ امر تسر کی زمین پر ہوا اور وہاں انھوں نے مقامی زبان اور طور طریقے سیکھے اور گھر بسائے۔ان حالات کا بیان ڈاکٹر خالد سہیل ''دھرتی ماں اداس ہے''میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''چنانچہ ہمارے خاندان کا قافلہ کشمیر سے چلا

تو اس نے امر تسر کی سر زمین پر آکر ڈیرے ڈالے

خیمے اور دل لگائے اور پھر گھر بسائے

جو لوگ اپنی مادری زبان کشمیر بولا کرتے تھے وہ پنجابی سیکھنے لگے اور دو

نسلوں کے بعد بے تکلفی سے بولنے لگے۔''(۳)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خالد سہیل کے آباؤاجداد کے تقریباًدو رشتے داروں نے امر تسر میں پرورش پائی۔امر تسر میں ان کے نانا کشمیر کی شالوں کا کاروبار کرتے تھے اور کاروباری غرض سے کلکتہ اور دیگر علاقوں میں آنا جانا رہتا تھا۔اس کاروبار کی حیثیت سے لوگ انھیں ''خواجہ صاحب'' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

وقت کی کایا ایک بار پھر پلٹی اور ۱۹۴۷ء میں دھرتی ماں پھر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے ہر شخص پر منفی اثرات چھوڑے۔گھروں کے گھر اور خاندانوں کے خاندان شہید ہوئے وہی لوگ جو ایک رات پہلے تک دوست تھے دشمن بن گئے اور زندگی نے بری طرح اس کا اثر قبول کیا ایک بار پھر ہجرت شروع ہوئی اور یہ اس بار یہ ہجرت مشرقی پنجاب (امر تسر) سے مغربی پنجاب (لاہور) کی جانب تھی۔ڈاکٹر خالد سہیل کے افسانے ''دھرتی ماں اداس ہے'' میں اس ہجرت کا کچھ اس طرح سے بیان ملتا ہے:

''ایک دفعہ پھر مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب ہجرت کرنی پڑی

پہلے جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہوا

جس میں ہمارے کئی ساتھی اور رشتہ دار قربان ہوئے اور پھر

ایک دن

آدھی رات کو

ایک دھرتی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی"(۴)

اپنی دھرتی سے پیار کرنے والوں کے لیے یہ ہجرت بہت ہی تکلیف دہ چیز تھی مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دھرتی سے محبت کرنے والوں نے کتنی قربانیوں سے اس ہجرت کو تکمیل تک پہنچایا۔ڈاکٹر خالد سہیل کے نزدیک یہ ہجرت غیر معمولی تھی جس نے نہ صرف ظاہری اثرات چھوڑے بلکہ نفسیاتی طور پر بھی لوگوں کو بہت متاثر کیا۔اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ

"پہلے ہجرت کا حال تو کانوں سے سنا تھا لیکن دوسری ہجرت کا حال تو ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے"(۵)

ڈاکٹر خالد سہیل کے ددھیال کے لوگ بھی کشمیر کے تھے ان لوگوں نے بھی کشمیر سے مشرقی پنجاب (امرتسر) اور پھر مغربی پنجاب (لاہور) میں ہجرتیں کیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل کا خاندان پڑھا لکھا اور مذہب کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔اس کے علاوہ سائنسی، منطقی اور نفسیاتی قدروں کا بھی لحاظ کرتے تھے۔ تعلیم کے بارے میں آپ کے خاندان کی رائے ہمیشہ مثبت رہی آپ کی والدہ عائشہ قاسمی اس معاملے میں بہت سخت عورت تھی یہاں تک کہ مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتی تھی۔ڈاکٹر خالد سہیل کے دادا ایک لبرل انداز کے مفکر اور صاحب علم تھے۔ مختلف معاملات میں اپنی رائے ضرور دیا کرتے تھے لیکن اپنی مرضی کسی پر مسلط نہیں کرتے کہ انسان کو خود حقائق کا مشاہدہ کر کے کوئی نظریہ قائم کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر خالد سہیل کے والد ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے امرتسر سے لاہور آئے اور پھر ۱۹۵۴ء میں لاہور سے کوہاٹ ہجرت کی اور آپ کے والد گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں شعبہ ریاضی کے اُستاد رہے۔ڈاکٹر خالد سہیل ایک علمی گھرانے میں پرورش پانے والے شخص ہیں۔آپ نے ابتدائی تعلیم کا آغاز پشاور سے کیا ڈاکٹر خالد سہیل کے دسویں کا امتحان پشاور کے ہائی سکول کنٹونمنٹ بورڈ سے پاس کیا اور اس کے بعد پشاور ہی کے ایڈورڈز کالج میں داخل ہو گئے اس کالج میں قیام کے دوران انھوں نے پہلا افسانہ "دست بوسی" تخلیق کیا جو کالج کے میگزین ایڈورڈین میں شائع ہوا اس افسانے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرے کی اصل تصویر کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔

ایڈورڈ کالج سے فراغت کے وقت ۱۷ آپ کی عمر ۱۷ برس تھی آپ کی والدہ اپ کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی اس بات کا ذکر ڈاکٹر سہیل کی خود نوشت میں بھی ملتا ہے کہ

"امی جان کو مجھے ڈاکٹر بنانے کا شوق اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے میرے بائیں کان کا آپریشن کروایا کیونکہ پیدائشی طور پر میرے بائیں کان کا نچلا حصہ غائب تھا میری امی جان میرے سر کو رومال سے ڈھانپے رکھتی تھی تاکہ لوگوں کو میرا آدھا کان نظر نہ آئے وہ سرجن سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ انھوں نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو آپ کی طرح ٹوپی والا ڈاکٹر بناؤں گی میری امی جان کا مجھے ڈاکٹر بنانے کا خواب اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ میں ڈاکٹر بن نہیں گیا۔"(٦)

ڈاکٹر خالد سہیل نے خیبر میڈیکل کالج پشاور میں درخواست دی پہلی بار درخواست مسترد ہو گئی لیکن دوبارہ درخواست دینے پر داخلہ ہو گیا اور ۱۹۷۴ء میں ایم۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کی اس کالج میں آپ کی ڈاکٹری کے علاوہ دیگر ادبی اصطلاحتیں بھی پروان چڑھتی گئیں۔ خیبر میڈیکل کالج پشاور سے ایم۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر خالد سہیل نے پشاور کے مشہور لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں سال بھر کی انٹرنشپ کی۔

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر خالد سہیل نے پاکستان کو خیر آباد کہہ دیا اور ایران چلے گئے۔ ایران میں بچوں کے ایک ہسپتال میں انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک طبّی خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۷۷ء میں میموریل یونیورسٹی کینیڈا میں نفسیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے روانہ ہو گئے اس یونیورسٹی میں نیوفاؤنڈ لینڈ میں نفسیات کے فیلوشپ کرنے کے لیے داخلہ مل گیا۔ نیوفاؤنڈ لینڈ کینیڈا کا مشرقی ترین صوبہ ہے جس کا دارالخلافہ سینٹ جانز ہے۔ ڈاکٹر خالد حسین نے سینٹ جانز میں چار سال گزارے اور وہاں کی معاشرت حسن اور رومان سے واقفیت حاصل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد خالد سہیل کو نیو برنزوک (New Brunswick) میں بطور ماہر نفسیات ملازمت مل گئی۔ اس شہر میں آپ نے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تقریباً دو سال رہے اس عرصے میں ڈاکٹر خالد سہیل وہاں کے فضا اور ماحول سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اس طرح تقریباً سات سال کے عرصے کے بعد ایک بار پاکستان واپس آئے چنانچہ پاکستان میں عارضی قیام کے بعد پھر واپس کینیڈا چلے گئے اور کینیڈا کو ہی اپنا وطن بنالیا۔

کینیڈا واپسی پر نیو برنزوک کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ٹورانٹو سے کچھ میل دور ایک شہر وھٹبی (Whitby) میں جا بسے۔ ۱۹۸۴ء سے ڈاکٹر صاحب وھبٹی میں ہی قیام پذیر ہیں۔وہاں ان کا ذاتی کلینک (Creative Psychotherapy Clinic) ہے جہاں وہ نفسیاتی مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل نہ صرف بہترین ماہر نفسیات ہیں اور ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر ہیں بلکہ ان کو اُردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ ہے اور ان کے افسانے، کالم، شاعری اور تراجم مختلف اخبارات اور مجلّوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

تصانیف:

شاعری:

۱۔ تلاش (۱۹۸۶ء)

۲۔ سمندر اور جزیرے (۲۰۰۶ء)

افسانے:

۱۔ ادھورے خواب (۲۰۱۳ء)

۲۔ زندگی میں خلا (۱۹۸۷ء)

۳۔ دو کشتیوں میں سوار (۱۹۹۴ء)

۴۔ دھرتی ماں اداس ہے (۱۹۹۷ء)

۵۔ چند گز کا فاصلہ (۲۰۱۳ء)

۶۔ دیوتا (۲۰۲۱ء)

ناول:

۱۔ ٹوٹا ہوا آدمی (۱۹۹۰ء)

۲۔ ورثہ ''لوک کہانیاں''(۱۹۹۳ء)

۳۔ دریا کے اس پار ''ناولٹ''(۱۹۹۷ء)

مضامین:

۱۔ انفرادی اور معاشرتی نفسیات ''مضامین اور خطوط''(۱۹۹۱ء)

۲۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والا مسافر ''مضامین اور انٹرویو''(۱۹۹۶ء)

۳۔ میرے قبیلے کے لوگ ''مضامین''(۱۹۹۸ء)

فلسفہ:

۱۔ بھگوان، ایمان، انسان (۱۹۸۸ء)

۲۔ خدا، مذہب اور ہیومنزم (۲۰۰۶ء)

۳۔ انسانی شعور کا ارتقا (۲۰۱۲ء)

تراجم:

۱۔ سوغات (۱۹۸۷ء)

۲۔ مغربی عورت، ادب اور زندگی (۱۹۸۸ء)

۳۔ کالے جسموں کی ریاضت (۱۹۹۰ء)

۴۔ ایک باپ کی اولاد (یہودی/مسائل اور ادب) مضامین، شاعری، تراجم (۱۹۹۴ء)

۵۔ ہر دور میں مصلوب (۱۹۹۵ء)

سوانح عمری:

۱۔ اپنا اپنا سچ سوانح عمری (۲۰۰۹ء)

ان کے علاوہ ڈاکٹر خالد سہیل کی انگریزی کتابیں بھی ہیں جن میں تراجم وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل ماہر نفسیات معالج ہمہ جہت فنکار، ادیب اور تخلیق کار ہیں وہ شاعری بھی کرتے ہیں افسانہ نگاری کے اصولوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور ناولٹ کے بھی خالق ہیں اس کے علاوہ مضامین بھی لکھتے ہیں، تراجم کا بھی کام کرتے ہیں، ڈائری بھی لکھتے ہیں اور شاعروں، ادیبوں اور قلم کاروں سے انٹرویو لینا توان کا خاص مشغلہ ہے غرض یہ کہ نثر کا میدان ہو یا شاعری کا اپنے تخلیقی اظہار کے لیے انھوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے اور کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ آج کے دور میں اپنی مصروفیات میں سے کیسے وقت نکال لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔شاید وہ ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت سے وقت کی نفسیات سے بھی واقف ہیں۔ بہرحال ان کی تخلیقات سے مستفید ہوا جا سکتا ہے کہ ان میں ایک سے زیادہ معاشروں کی تہذیب، تجربہ اور روایات موجود ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''دیوتا'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر خالد سہیل کا افسانوی مجموعہ ''دیوتا'' سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے پہلی بار ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل ۲۵ منتخب افسانے اور دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر خالد سہیل کے یہ دو مضامین دراصل آپ کے دو افسانوی مجموعے ''دو کشتیوں میں سوار'' اور ''دھرتی ماں اداس'' ہے کا تعارف ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''دیوتا'' تقریبا ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اس مجموعے میں شامل افسانے معاشرتی، فلسفہ اور نفسیاتی نوعیت کے ہیں۔ڈاکٹر خالد سہیل معاشرے کو ایک نئے انداز سے دیکھتے ہیں آپ کا قلم نہ صرف حقائق بیان کرتا ہے بلکہ حقائق کی تلاش کے لیے نئے راستے بھی ہموار کرتا ہے آپ نے زیادہ تر انسان کی ذات کو موضوع بنایا اس کے مسائل چاہے روحانی ہر لحاظ سے معاشرہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کا پاکستان کو خیر آباد کہہ کر ایک نئ تہذیب میں بسنا گویا تخلیقات میں تنوع پیدا کرتا ہے ایک سے زیادہ تہذیبوں کا رنگ ان کی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتا ہے اس مجموعے کے تقریباً ہر افسانے کی

تاریخ لکھی گئی ہے جس سے ان کے ذہنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے اس مجموعے کا نام اس میں شامل ایک افسانے کے موضوع پر رکھا گیا ہے اور یہ افسانوی مجموعہ ڈاکٹر خالد سہیل نے اپنے مرحوم دوست سعید انجم کے نام کیا ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل کے اس مجموعے میں موجود افسانوں کے عنوانات انتہائی سادہ ہیں بعض عنوانات ایسے ہیں کہ جن کی پوری کہانی اس عنوان میں چھپی ہوتی ہے اور بعض موضوع تو ایسے ہیں کہ افسانہ پڑھنے کے بعد صرف عنوان یاد رکھ لیا جائے تو کہانی یاد رہ جاتی ہے۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''مکین کہیں اور چلا گیا'' ایک ایسی مریض کی کہانی ہے جسے کچھ بھی یاد نہیں یعنی ذہنی طور پر مفلوج ہو چکی ہے اس کی یادداشت کام نہیں کر رہی یعنی صرف اس اس کا وجود باقی رہ گیا ہے تو اس پر اس کی دوست کہتی ہے کہ

''۔۔۔۔میں واپسی کا سارا راستہ آنسو بہاتی رہی اور سوچتی رہی مکان رہ گیا ہے مکین کہیں اور چلا گیا ہے''(۷)

افسانہ ''چند گز کا فاصلہ'' زندگی کی مشکلات اور مصائب کو بیان کرتا ہے کہ زندگی جس طرح بھی ہے آخر گزرنی تو ہے اس میں اپنی منزل کی جانب جاتے ہوئے بہت سے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کٹھن سفر ہم سے پہلے لوگوں نے بھی طے کیا اور ہمارے بعد آنے والے بھی طے کریں گے۔

اس افسانوی مجموعے میں خالد سہیل نے اپنا ایک مشہور افسانہ ''دھرتی ماں اداس'' ہے بھی شامل کیا ہے۔ اس افسانے میں وہ اپنے وطن سے ہجرت کا تفصیل سے بیان کرتے ہیں اپنا گھر اور وطن چھوڑنا ایک ناممکن سا عمل لگتا ہے لیکن وہ وقت جس میں ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور لوگ اپنی جان، ایمان اور خاندان کو بچانے کے لیے وہ آگ کا دریا پار کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے جس کا کبھی گمان بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ افسانہ پڑھتے ہوئے وہ سارا منظر سامنے آجاتا ہے ایک خوفناک تصویر آتی ہے کہ اس وقت ہجرت کرنے والے کس طرح اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک نئی جگہ پر آئے اور آباد ہوئے۔ بغیر چھت اور بے سروسامانی کی حالت میں گویا قیامت کا منظر تھا۔

افسانہ ''جڑیں، شاخیں، پھل'' ایک ہی تہذیب میں بسنے والوں میں مختلف ذہنوں کی عکاسی کرتا ہے آغاز میں خاندان کے جڑے ماضی کے رشتوں کی طرف اشارہ ہے جس کا بیان کچھ یوں ہے:

''خاندان بھی درختوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے درختوں کی شاخیں جڑوں کو پھلوں سے ملاتی ہیں اسی طرح خاندان ماضی کا مستقبل سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔''(۸)

اس افسانے میں ''محمد'' مذہب پسند ہے جو اپنے بچوں پر مذہب کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے لیکن بچے زبردستی مذہب مسلط کرنے پر بغاوت کا سوچ رہے ہیں۔ دوسری طرف ''خالد'' غیر شادی شدہ آزاد خیال کردار ہے جس کے لیے زندگی میں دنیا کی رونق ہی سب کچھ ہے وہ رومان پسند ہے اور زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس افسانے کا آخری مرکزی کردار ''سہیل'' ہے جو اپنی زندگی سے مطمئن اور پر امید ہے ان کے نزدیک ہر شخص ایک خاص عمر کے حصے میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنے کا اہل ہو جاتا ہے اور اسے اپنے ہر معاملے میں ذمہ داری خود ہی قبول کرنی چاہیے اپنے کیے ہر فیصلے پر خود کو بااعتماد شہری سمجھے گا جس سے زندگی آسان ہو جائے گی۔

افسانہ ''ہمزاد'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کا جسم مرد کا ہے اور اس میں ایک عورت محصور ہے۔ اصل میں یہ ایک المیہ ہے کہ وہ اپنے اس راز کو آشکار نہیں کر سکتا۔ اس ڈر سے کہ اس کی بیوی جس کے ساتھ دس سال گزار چکا ہے کیا سوچے گی۔ نفسیاتی طور پر وہ تقریباً ہر روز منوں وزن کے نیچے دبتا ہے ایک ایسا بوجھ اس کے سر پر ہے جو وہ نہ کسی کو بتا سکتا ہے اور نہ ہی اٹھا سکتا ہے آخر کار حقیقت سامنے آ ہی جاتی ہے وہ ایک ڈاکٹر تھرپسٹ کے پاس جاتا ہے جو اسے اس کی ذہنی کشمکش سے آزاد کرتا ہے اور سچ کو ظاہر کرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے اس طرح وہ ایک دن اپنی بیوی کے سامنے سچ ظاہر کر دیتا ہے اور ذہنی طور پر خود کو آزاد محسوس کرتا ہے۔

اس مجموعے کا آخری افسانہ ''دیوتا'' ہے جس کے عنوان پر مجموعے کا نام رکھا گیا ہے دیوتا ایک ایسا شخص تھا جس سے مل کر لوگ خوش ہو جاتے اپنی زندگی کے مصائب و آلام سے نجات پاتے تھے اصل میں یہ شخص ایک درویش تھا جو لوگوں کو دعائیں دیتا تھا۔ خدا کے حکم سے لوگوں کی مشکلات آسان ہو جاتی تھی ایک دن جب خبر پھیلی کے ''دیوتا مر گیا'' تو لوگ اس کی طرف لپکے اس دیوتا کے پاس پہنچے تو ایک لاش کو وہاں جس نے مرنے سے پہلے زمین پر انگلی سے لکھا تھا کہ

''تم میں سے ہر انسان ایک دیوتا ہے''(۹)

حواشی

۱۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، دیوتا (لاہور: سانجھ پبلیکیشنز، ۲۰۲۱ء)، ۳۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۶۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، سچ اپنا اپنا (لاہور: دار الشعور پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۱۱۔

۷۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، دیوتا، ص ۱۸۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۴۰۔

باب چہارم

سیّد حامد یزدانی: شخصیت اور فن

اور

افسانوی مجموعہ ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' کا تجزیاتی مطالعہ

تعارف:

سیّد حامد یزدانی ۱۹۶۱ء میں فیصل آباد میں گیلانی سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا ذوق اپنے والد ممتاز شاعر سیّد عبدالرّشید یزدانی جالندھری سے وراثت میں پایا۔ ۸۰ء کے عشرے میں ادبی منظر نامے پر بطور شاعر نمودار ہوئے۔

تعلیم و تربیت پاکستان کے ادبی و ثقافتی مرکز لاہور میں ہوئی۔ دورانِ تعلیم یونیورسٹی گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلہ "راوی" کے مدیر معاون رہے اور مجلس اقبال، انجمن فارسی، پنجابی مجلس اور دیگر ادبی تنظیموں میں بھی عہدیدار رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے بی۔اے اور جامعہ پنجاب سے ایم۔اے سوشیالوجی کیا جبکہ ماسٹر آف سوشل ورک کی ڈگری ولفریڈ لوریے یونیورسٹی، واٹرلو کینیڈا سے حاصل کی اور سماجی خدمات کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔

حامد یزدانی کی شاعری فنون، اوراق، افکار، تخلیق، سیپ، محفل، شام و سحر اور بیسویں صدی جیسے ادبی جرائد میں شائع ہوئی۔ ماہنامہ "سورج" ماہنامہ "فانوس" اور ماہنامہ "بازگشت" کے مدیر رہے۔ روزنامہ "امروز" اور روزنامہ "جنگ" کے ادبی صفحات کے لیے بھی کام کیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے جائنٹ سیکریٹری رہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور اور پاکستان ٹیلی ویژن کے ادبی پروگراموں میں شریک ہوئے۔ ان کی غزلیں اور گیت اُستاد حامد علی خان، ثریا ملتانیکر، غلام عباس، ترنم ناز، اُستاد قادر علی شگن، استاد امجد امانت علی خان، مریم رامے، کوثر علی، انجم شیرازی، اُستاد اختر علی اور دیگر گلوکاروں کی آوازوں میں ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی سے نشر ہو چکے ہیں۔ حامد یزدانی نے ریڈیو ڈوئچے ویلے کولون وائس آف جرمنی کی اُردو سروس میں بہ طور پروڈیوسر جبکہ ریڈیو پاکستان میں بہ حیثیت براڈکاسٹر خدمات انجام دیں۔ اب مستقل طور پر ٹورانٹو، کینیڈا میں سکونت پزیر ہیں۔ حلقہء اربابِ ذوق ٹورانٹو کے سیکریٹری ہیں اور لاہور اور ٹورانٹو سے شائع ہونے والے ادبی مجلّہ ترسیل کے شریک مدیر ہیں۔

حامد یزدانی کی بنیادی ادبی حیثیت تو ایک شاعر کی ہے اور اس حوالے سے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے شعری مجموعے "ابھی اک خواب رہتا ہے"، "گہری شام کی بیلیں"، "رات دی نیلی چپ"، "اطاعت" اور "ہم ابھی رستے میں ہیں" ان کی پہچان کو کافی ہیں۔ وہ اپنے جذبات کو شاعری کے ذریعے بیان کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

حامد یزدانی کے افسانوں کے بارے میں زاہد حسن لکھتے ہیں:

''حامد یزدانی اپنے ہر افسانے میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لیکن ہر افسانے سے باہر اپنے کرداروں اور ان کے حالات و واقعات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس مجموعے (خالی بالٹی اور دوسرے افسانے) میں شامل سبھی کہانیاں اپنا خمیر ان جگہوں، لوگوں، موسموں اور ان حالات سے اٹھاتی ہیں جو سمے کی صورت اس کی زندگی کی دہلیز سے ہو کر گزرے، اور سمے کے بے رحم تھپیڑوں نے انھیں دھول اور دھند کی صورت بہتے ساگروں کے سپرد کر دیا ہے۔ ان کہانیوں میں لاہور تو ہے، جرمنی، جرمنی کے شہر، یورپ اور پھر کینیڈا۔۔۔اس دوران جن خطوں کے لوگ اس سے ملے اور مل کر بچھڑے، وقت اور لوگوں کے ذریعے جو کہانیاں اور کردار اس سے ملے اور ان کہانیوں کا حصہ بنے وہ سب فطری طور پر اور تخلیقی انداز میں ان کہانیوں میں بسیرا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔''(۱)

حامد یزدانی اپنے آبائی وطن سے دور رہ کر بھی اس کی محبت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک نئی تہذیب میں رہ کر اپنی پرانی روایات کو یاد رکھنا ان کا وصف ہے۔ وہ ایک محبِ وطن اور سچا مسلمان ہے۔ اپنے وطن کی یاد اور محبت ان کو بے شمار مصروفیات کے باوجود ستاتی ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

لاہور کی حسین فضاؤں سے دور ہوں
لگتا ہے جیسے ماں کی دعاؤں سے دور ہوں

گرمی کی شام موتیا، سردی کی شب گلاب
موسم کی دل فریب اداؤں سے دور ہوں

گم ہوں دیارِ غیر کے اس برف زار میں
اپنوں کی پرتپاک جفاؤں سے دور ہوں

اک دشت بے اماں کی خموشی ہے چار سو
شہرِ وفا کی میٹھی صداؤں سے دور ہوں

اک یاد بن کے رہ گئی سر سبز چاندنی
جب سے خیال یار کی چھاؤں سے دور ہوں

میں دور ہوں کسی گل خوش رو کی آنچ سے
آنچل کی مہکی مہکی ہواؤں سے دور ہوں

حامد یزدانی اپنی بات کو الفاظ کے جادو سے منوانے کا ہنر رکھتے ہیں۔اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر ملک میں چاہے جتنی مرضی آسائشیں میسر ہوں لیکن اپنے آبائی وطن کی مٹی میں ایک الگ قسم کا سکون ہوتا ہے۔ گویا موصوف ان لوگوں میں سے نہیں جو ایک بار اپنے ملک کو خیر آباد کہہ دیں تو واپس نہیں پلٹتے بلکہ آپ اپنے کلام کے ذریعے ثابت بھی کرتے ہیں۔

تصانیف:

کینیڈا سے یزدانی خاندان کے چشم چراغ ممتاز شاعر محترم حامد یزدانی صاحب کے اُردو افسانوں کا پہلا مجموعہ ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' ہے اس سے پہلے ان کے پانچ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ان مجموعوں کے نام یہ ہیں:

شاعری:

ابھی اک خواب رہتا ہے (اردو شاعری) طبع اوّل (۱۹۹۲ء)

رات دی نیلی چپ (پنجابی شاعری) طبع اوّل (۲۰۰۶ء)

گہری شام کی بیلیں (اردو شاعری) طبع اوّل (۲۰۰۷ء)

اطاعت (اردو نعتیں) طبع اوّل (۲۰۱۰ء)

ہم ابھی رستے میں ہیں ''اردو نظمیں اور غزلیں'' (۲۰۲۳ء)

افسانے:

خالی بالٹی اور دوسرے افسانے۔ طبع اوّل (۲۰۲۲ء

تراجم:

From one loneliness to another (2023)

(English translation of Urdu poems by M. Salim ur Rehman)

افسانوی مجموعہ: ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے''

افسانوی مجموعہ ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے ''میں شامل ان کے افسانے بہت خوبصورت اور ان کے ذاتی مطالعات اور مشاہدات و تجربات کے آئینہ دار ہیں۔ان کی اس افسانوی مجموعے میں شامل کہانیاں ہم پر منکشف کرتی ہیں کہ ان کے ہاں زبردست موضوعاتی تنوّع بھی موجود ہے اور دل کش اسلوب اور خوبصورت زبان و بیان بھی۔ان کے اس مجموعے میں اٹھارہ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ان افسانوں کے علاوہ دو مضامین جو اس مجموعے میں شامل کئے گئے ہیں ان کے عنوان ملاحظہ ہوں:

- حامد یزدانی کے افسانے: ایک تعارف از (امجد طفیل)
- کہانی کی آنکھ سے دیکھی گئی کہانیاں: از (زاہد حسن)

حامد یزدانی کے افسانوں کے مجموعے کا دیباچہ ممتاز افسانہ نگار امجد طفیل اور اختتامیہ جواں سال ناول نویس زاہد حسن نے لکھا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' کا تجزیاتی مطالعہ

حامد یزدانی صاحب کے افسانوں ایک خاص بات یہ ہے کہ کہ ان میں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بذات خود بندہ ان چیزوں دیکھ کر محسوس کر رہا اور ان سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ان کی کہانیاں آج کل کے موقع و محل کے عین مطابق ہیں۔کردار اپنا روپ برقرار رکھتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

حامد یزدانی کے اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''دیوار'' ہے ۔ یہ افسانہ جرمنی اتحاد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔افسانے میں جرمن کردار ہیر شمٹ اور پاکستانی تارکِ وطن فضل ہے۔ فضل دیوارِ برلن کے ٹکڑے بیچ رہا ہے اور جو ٹکڑا مرکزی کردار لیتا ہے وہ وچھوڑے کی نشانی ہے اور اس پر رنگوں کی آمیزش سے عبرانی زبان میں ''گریہ'' لکھا ہوا ہے۔ یہاں دیوار دراصل جدائی اور فراق کی تاریخی علامت بن کر آتی ہے جو بظاہر دو ملکوں کے اتحاد کے سائے میں کہانی کے مرکزی کردار اور اس کے دوستوں کے درمیان فراق کی داستان سناتی ہے۔

افسانہ ''خاکی تھیلا'' کووڈ-۱۹ کی صورتحال کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے جس میں انسانی کردار کے اندر تبدیلی کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔اس میں منظر ایک کیفے کا ہے اور اس کہانی کا مرکزی کردار ''وہ'' کیفے میں وبا سے پہلے کی تزئین و آرائش ڈھونڈ رہا ہے۔کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی لڑکی کا کہنا ہے کہ

> ''اس جان لیوا وبا کی وجہ سے کیفے بند ہوا تو خوش قسمتی سے ہمیں رینوویشن کا موقع مل گیا۔ دیکھئے، سب کچھ نیا کر دیا ہے۔ دیواروں کے رنگ و روغن سے لے کر چھت، فرش اور میز کرسی تک سب کچھ بالکل نیا اور دل کش۔۔۔ نہیں کیا؟''(۲)

افسانہ نگار نے بڑی چابک دستی اور ہنر مندی سے چند جملوں میں عالمی وبا کے بعد طرزِ زندگی میں تبدیلی کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔افسانے کے آخر میں محسوس ہوتا ہے کہ افسانے کے شروع میں کیفے میں داخل ہونے والا فرد اور افسانے کا راوی ایک ہے ہیں اور یہی فن افسانہ نگاری کی خوبی ہے۔

افسانہ ''نوسٹاپنگ زون'' کینیڈا کے ایک شہر میں ایک پاکستانی اور ایک فلسطینی مسلمان کے درمیان ملاقات اور مکالمے کی روداد ہے جو یہ بتاتی ہے کے دونوں کرداروں میں جہاں بہت سی قلبی وابستگیاں ہیں وہاں بہت سی ذہنی دوریاں بھی ہیں۔اس افسانے میں حامد یزدانی نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے فلسطین کے بارے میں فطری جذبات کو پیش کیا ہے اور مغرب میں آباد ہونے والے ایک فلسطینی مسلمان کی احساسات کو بھی نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

افسانہ ''Love Letter'' ہمیں متحدہ پاکستان کے ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جو بحثیت قوم ہم پر بہت ناگوار گزرے اور جن کو ہم ہمیشہ سے بھولنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں شاید اندازہ نہیں کہ جو قومیں اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہیں وہ کبھی بہتر مستقبل کی تعمیر میں کامیاب نہیں ہوتیں۔اس افسانے میں محبت کی دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔پروفیسر فاروقی اوران کی بیگم کی محبت کی کہانی اور افسانے کے راوی احمد کے چچا ظہیر اوران کی کلاس فیلو طلعت کی محبت کی کہانی۔ طلعت کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے اس لیے دو افراد کے درمیان محبت کا یہ تعلق پاکستان کے دو حصوں کے درمیان تعلق کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ مگر افسوس انفرادی محبت کے رشتے اجتماعی خطاؤں کا مداوا نہیں کر سکتے۔

حامد یزدانی کا افسانہ ''دروازہ'' اپنے اندر جدید طرزِ زندگی اوران کے ثقافتی پہلوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اگر ہم مصنف کی ذاتی زندگی کے تجربات کا عکس کہیں تو شاید بے جا نہ ہو گا۔اس افسانے میں تارکینِ وطن کا ذکر ملتا ہے جو اپنی زندگی کو بہترین اور خوشگوار بنانے کے لیے کسی دوسرے وطن میں آباد ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اولاد کے خود مختار ہونے کے بعد تہذیبی ترجیحات اور ثقافتی تضادات کے دوراہے کی حقیقت کو پاتے ہیں اور ایک قسم کی بے چارگی اور تنہائی کی مجسم تصویر بن جاتے ہیں۔

حامد یزدانی کا افسانہ ''پیڑ'' بہت ہی خوبصورت انداز میں لکھا گیا ہے۔اس میں آغاز تو ایک درخت سے ہوتا ہے جو پرندوں کو آسائشیں فراہم کر کر کے تھک گیا ہے۔اب وہ اکیلا رہنا چاہتا ہے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اسے ویسے ہی اجاڑ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے اب اس سے فائدہ حاصل کرنے والے اسے تنہا چھوڑنا چاہتے ہیں۔ کا مرکزی کردار بچوں کو بتاتا ہے کہ

''اپنے وہ ہوتے ہیں جو ہر موسم میں، حالت میں اپنے رہیں، ساتھ رہیں''(۳)

پیڑ کی مثال سے گویا وضاحت کی گئی ہے کہ گھر کے بزرگ کی مثال بھی ایسے ہی ہے جو زندگی کے بے شمار مصائب سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ سکون چاہتا ہے۔اور اسے حامد یزدانی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ہاں، ویسے بھی پیڑ کی اصل جگہ تو صحن ہی میں ہوتی ہے۔ پھر کیا فرنٹ یارڈ اور کیا بیک یارڈ۔ کیا فرق پڑتا ہے، میرے بیٹے''(۴)

''ٹیوب'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں مختلف فوبیاز کا شکار کہانی کا مرکزی کردار اپنی چھٹیاں گزارنے جرمنی سے لندن یعنی انگلستان آیا ہوا ہے اور ٹیوب یعنی وہاں کی انڈر گراؤنڈ ٹرین میں اپنی فیملی کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اور اس دوران بے شمار حادثات اور ان سے جڑے خدشات کو افسانہ نگار نے جس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے اس انداز میں لکھنا آسان کام نہیں۔

حامد یزدانی دورِ حاضر میں ایک اچھے افسانہ نگار اور شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے جدید دور کی بہترین عکاسی کرتے ہیں اور ان میں سے نہ صرف معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں بلکہ یہ اصلاحی پہلو سے بھی مالا مال دکھائی دیتے ہیں۔ حامد یزدانی کے افسانوں میں انگریزی کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ ان کا خاصا ہے کہ وہ کس طرح ان کو ایک مربوط نظام کے تحت اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ بہت جلد ان کا شمار اعلیٰ پائے کے افسانہ نگاروں میں ہو گا اس لیے ان کے اگلے افسانوی مجموعے کا منتظر ہوں۔

امجد طفیل لکھتے ہیں:

''حامد یزدانی کے پہلے افسانوی مجموعے کا تعارف تحریر کرتے ہوئے مجھے بہت مسرت کا احساس ہو رہا ہے اور یہ خوش کن گمان بھی گزرتا ہے کہ آنے والے دنوں میں افسانہ، یاد نگاری ہو سکتا ہے کہ ناول ان کے تخلیقی جوہر کا اظہار بن جائے۔ زیرِ نظر مجموعہ کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی بھی جان سکتا ہے کہ حامد مین افسانہ نگاری کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے ۔ موضوعات کا تنوع، سلجھے ہوئے زبان و بیان اور بات کو سلیقے سے کہنے کا ڈھنگ ان کی تحریر کا خاصا ہے۔ مجھ امید ہے کہ اس کتاب کے قارئین حامد یزدانی کے ہر افسانے کو ذوق و شوق سے پڑھیں گے اور اس سے اسی طور لطف اندوز ہوں گے جس طور میں ہوا ہوں۔''(۵)

زاہد حسن لکھتے ہیں:

”حامد یزدانی اور میرا ناسٹلجیا، ایک ہی سا ہے۔ رنگ ڈھنگ، قد قامت یہاں تک کہ عمر میں بھی۔ میں ۱۹۸۵ء میں اپنی بستی چھوڑ کر لاہور آیا۔ حامد ۱۹۸۹ء میں لاہور چھوڑ کر جرمنی اور پھر کینیڈا چلا گیا۔ اور اب بتیس برس سے لاہور سے دور ہے۔ میں پینتیس برس سے لاہور میں ہوں۔ اچھنبے کی بات یہ نہیں کہ میں اتنے برس سے لاہور میں ہوں بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ حامد اتنے برس سے لاہور میں نہیں، لیکن لاہور اس میں ہے۔ لاہور اس میں زندگی بھر رہے گا۔ حامد یزدانی کے ان افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات کی اور کہی جا سکتی ہے کہ یہ افسانے نہ صرف اپنے موضوعات، زبان و بیان بلکہ اپنی تکنیک کے اعتبار سے بھی ہم پر اک جہانِ نو کے در وا کرتے ہیں۔ یہ جہان نو بظاہر ہمارے افسانہ نگار کے تجربہ اور مشاہدہ میں رہا ہے تاہم اب ہم بھی اس کے ذائقوں، رنگوں اور لطافتوں سے ہم آہنگ و آشنا ہو سکتے ہیں۔“(۶)

حواشی

۱۔ زاہد حسن، ''کہانی کی آنکھ سے دیکھی گئی کہانیاں،'' بیاض ۳۱، شمارہ ۹ (ستمبر ۲۰۲۳ء): ص ۴۲۔

۲۔ حاؔمد یزدانی، سیّد، خالی بالٹی اور دوسرے افسانے (لاہور: سانجھ پبلیکیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۳۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔

باب پنجم

ڈاکٹر بلند اقبال: شخصیت اور فن

اور

افسانوی مجموعہ ”فرشتے کے آنسو“ اور ”میری اکیاون کہانیاں“

کا تجزیاتی مطالعہ

تعارف:

ڈاکٹر بلند اقبال ۷ اپریل ۱۹۶۶ء کو حیدر آباد سندھ ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک مشہور ادبی شخصیت حمایت علی کے فرزند ہیں جو ادب سے خاصا شغف رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ معراج نسیم افسانہ نگاری سے خاصا لگاؤ رکھتی تھیں۔ اس ادبی ماحول کے اثرات ان کی شخصیت پر بھی پڑے جو ایک فطری بات ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد میں آپ نے بھی طبع آزمائی کی اور خاصی شہرت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ اب پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ بلند اقبال کے تین بھائی روشن خیال، اوج کمال اور ذوالجمال ہیں۔ بلند اقبال کی شریک حیات کا نام شجیعہ محمود ہے اور بچے جوزیر، علائنا، ژویرا اور ایشل ہیں۔

جہاں بلند اقبال ایک طرف مشرقی اقدار و روایات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور دوسری طرف مغربی اقدار کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ اس طرح ان کو دو مختلف تہذیبوں سے آشنا ہونے موقع ملا۔ موصوف اب مستقل طور پر کینیڈا میں سکونت پزیر ہیں۔

ڈاکٹر بلند اقبال ہمہ جہت شخصیت کے مالک بیک وقت افسانہ نگار، ناول نویس، ڈرامہ نگار، کالم نگار اور ٹی وی اینکر بھی ہیں۔ اعلیٰ ترین ملکی و غیر ملکی یونیورسٹیز سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ آپ نے میڈیسن میں گریجویشن ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی، پوسٹ گریجویشن نیویارک میڈیکل کالج اور فیلوشپ کی ڈگری اور یگون ہیلتھ سائنسز یونیورسٹی، امریکہ سے حاصل کی۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور آپ کینیڈا میں میڈیکل اسپیشلسٹ کے طور پر کئی ہسپتالوں سے منسلک ہیں۔

ڈاکٹر عروج اختر زیدی کا کہنا ہے کہ

> ”ڈاکٹر بلند اقبال کا تعلق ایک ایسے شعبہ سے ہے جو زندگی کے تمام افسانوں کا سرچشمہ ہے۔ یہیں زندگی کے افسانے کی ابتدا ہوتی ہے، یہیں اس میں انواع و اقسام کے رنگوں کی آمیزش کی جاتی ہے اور یہیں یہ افسانہ سسکتے سسکتے دم بھی توڑ دیتا ہے۔ بلند اقبال زندگی کی ان تمام مراحل اور کیفیات کے عینی شاہد ہیں، شاید اسی لیے ان کا قلم زندگی کے ان سربستہ اسرار و رموز سے کماحقہ واقف اور ان کو بے کم و کاست بیان کر دینے پر قادر بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں مواد اور موضوع کی بدلتی ہوئی نوعیت کو تیز رفتاری کے ساتھ گرفت میں لینے

> کی وہ صلاحیت بڑے پیمانے پر ملتی ہے جو فنکار کو اپنے عصر موجود سے باخبر رہنے کی دلیل مہیا کرتی ہے۔یہی گرفت ان کے زندہ اور فعال معاشرتی شعور کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔"(۱)

گزشتہ کئی برسوں سے ہندوپاک کے معتبر اور مستند رسائل و جرائد میں آپ کے افسانے برابر شائع ہورہے ہیں۔ آپ کی اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان میں "فرشتے کے آنسو" (افسانوی مجموعہ)، "میری اکیاون کہانیاں" (افسانوی مجموعہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بلند اقبال ۲۰۱۲ء میں میڈیا سے منسلک ہوئے اور مختلف ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر سنجیدہ گفتگو پر مبنی پروگرامز کئے جن میں ٹی وی شو "پاس ورڈ" اور پروگرامز "دانائی کی تلاش میں" اور "دی لائبریری وِد ڈاکٹر بلند اقبال" قابل ذکر ہیں۔

بلند اقبال کے افسانوں کی ایک خوبی اختصار ہے یعنی اس سے وہ اپنی بلند فکر کو گویا سمندر کو کوزے میں سمونے کا ہنر جانتے ہیں۔اس بارے میں طاہرہ نقوی لکھتی ہیں کہ

> "بلند اقبال کے افسانوں کی ایک اہم خوبی اختصار ہے۔انگریزی کا لفظ شارٹ سٹوری ان پر درست معنی میں صادق اتا ہے ۔انھوں نے اپنے کسی افسانے میں کوئی اضافی فقرہ نہیں لکھا۔کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنا خوبی ہے جو اس کتاب کے ہر ایک افسانے میں موجود ہے۔"(۲)

تصانیف:

ڈاکٹر بلند اقبال کو جو ادبی ماحول اپنے گھر میں ملا اس سے ان کے اندر کے فن کار کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔والد صاحب ایک مشہور افسانہ نگار، ناول نگار اور والدہ بھی افسانہ نگار تھی۔اس سے ان کا ذوق ادب کی مختلف اصناف میں پیدا ہوا اور پھر آپ نے بھی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور پھر ایک بہترین افسانہ نگار، ناول نگار اور کالم نگار کے طور پر ظاہر ہوئے اور خوب شہرت حاصل کی۔ان کے بارے میں سلطان جمیل نسیم کا کہنا ہے کہ

> "مجھے جب بھی ذہانت تخلیقی حسن اور اختصار کے ساتھ نت نئے موضوعات لیے ملی ہے میں نے بلا جھجک اسے بلند اقبال کا افسانہ سمجھا ہے اُردو کے افسانوی ادب میں جس تیزی

کے ساتھ ڈاکٹر بلند اقبال نے مقام اعتبار حاصل کیا ہے وہ کم کم ہی نظر آتا ہے۔ان کے افسانوں میں ہماری زندگی کا پرتو مکمل حقیقت کے ساتھ ملتا ہے پھر اس حقیقت کو حسنِ اختصار کچھ اور بھی نکھار دیتا ہے۔ بلند اقبال کی اٹھان بتاتی ہے کہ ابھی ان کو افسانے کی مزید بلندیوں کی طرف جانا ہے۔"(۳)

افسانے:

"فرشتے کے آنسو" طبع اوّل (۲۰۰۷ء)

"میری اکیاون کہانیاں" طبع اوّل (۲۰۱۲ء)

ناول:

"ٹوٹی ہوئی دیوار" (۲۰۱۶ء)

"کھوئے ہوئے صفحات" (۲۰۲۱)

مضامین:

"سارے ہی محبت نامے میرے" (۲۰۲۲ء)

افسانوی مجموعہ: "فرشتے کے آنسو"

اس افسانوی مجموعے میں کل ۳۶ افسانے ہیں جو ان کے تخلیقی فن کے آئینہ دار ہیں۔اس افسانوی مجموعے کے بارے میں تسلیم الہیٰ زلفی کا کہنا ہے کہ

""فرشتے کے آنسو" میں بلند اقبال قدم قدم پر ایک کامیاب تخلیق کار کے طور پر خود کو تسلیم کرواتے ہیں۔اردو افسانوں میں شاید یہ کتاب ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جس میں کسی طرح کا غیر ضروری تکلف یا اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ہر کہانی میں قاری کو اپنی ذات کے کسی گم شدہ گوشے سے آگاہی ہوتی ہے۔اور یوں لگتا ہے مصنف غیر

محسوس طور پر قاری کو اپنے فن کا حصہ بنالیتا ہے اور دونوں کے مابین تخلیق ایک رابطے کا کام کرتی ہے۔''(۴)

افسانوی مجموعہ ''فرشتے کے آنسو'' کا تجزیاتی مطالعہ

ابتدا میں بلند اقبال کا بہت اہم افسانہ ''کارٹون'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو رشوت خور، غیبت کرنے والا، دوسروں کا مال کھانے والا اور دکھاوا کرنے والا ہے۔ لیکن ہر برے عمل کے بعد اس کا سامنا ایک ایسے کارٹون سے ہوتا ہے جو ہو بہو اسی کی شکل کا ہے جو کبھی بندر بن کر سامنے آتا ہے، کبھی پیٹ کا کیڑا بن جاتا ہے تو کبھی طوطے کی شکل میں آکر اسے ملامت کرتا ہے۔ بلند اقبال لکھتے ہیں:

''بابا وہ کارٹون ہو بہو میری شکل کا ہے۔ میرے جیسا ناک نقشہ، میرے ہی جیسی ادائیں، وہ اچانک مجھ میں سے نمودار ہوتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے بابا پہلی بار میں نے اسے کب دیکھا تھا؟ میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہا تھا، میرے ہاتھوں میں تمہاری ہی دی ہوئی تسبیح تھی جس کے دانوں کو پڑھتا ہوا میں گھر آرہا تھا کہ اچانک یہ کارٹون مجھ میں سے نکل کر میرے سامنے آکھڑا ہوا اور پھر مجھے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی دم لمبی ہوگئی ہے اور شکل بندر جیسی اور پھر ایسے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ ساری نمازیں پڑھ کر بھی تو مجھے بندر جیسا لگتا ہے''(۵)

اصل میں بلند اقبال نے انسان کے ضمیر کو اس کارٹون سے تشبیہ دی ہے کہ انسان جتنا مرضی گنہگار ہو آخر اس کا ضمیر اسے لازمی بُرا کام کرتے ہوئے جھنجھوڑتا ہے لیکن انسان کا نفس امارہ اسے پھر برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔

افسانہ ''ادھورا کافر'' ایک ہوس پرست جبران کی کہانی ہے۔ جبران حُسن کا شیدائی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ اس کے مقدر میں خدا کی طرح تنہائی ہے لیکن عمر کا پچیسواں سال اس کی زندگی میں بہاریں لے آیا۔ ایک دن اس کی نظر نیلوفر پر پڑتی ہے اور وہ اس کہ حُسن سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ جبران حُسن کا شیدائی تو تھا لیکن دوسری طرف وہ ہوس کا پجاری بھی تھا تو جلد ہی اس کا دل نیلوفر سے بھر گیا اور وہ پھر ایک نیلوفر سے دوسری، دوسری سے پھر تیسری اور اسی طرح کئی عورتوں سے مل کر جنسی رویوں کے راز جاننے میں مگن ہو گیا۔

پہلی بیٹی کے بعد اس نے نیلوفر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ روز روز کے سوالات سے تنگ تھا اور پھر وہ ایک دن نیلوفر اور اپنی بیٹی کو چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ وہاں بھی اس کی عیاشیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ جبران خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا جس سے معاشی طور پر اسے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

ایک وقت ایسا آیا کہ اسے نشے کی حالت میں بھی اپنی بیٹی کا چہرہ یاد آتا تھا اور ذہن میں ایک سوال تھا۔ شاید یہ سوال اس کی زندگی کے بُرے کاموں سے پچھتاوے کو ظاہر کرتے ہے۔ بلند اقبال لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک خیال تھا جو اس کے ذہنی اپچ میں سمانے سے انکاری تھا، ایک ایسا خیال جو اسے اکثر آدھی رات کو سوتے میں سے اٹھا دیتا تھا۔ اسے خوب ساری شراب پلاتا تھا اور تنہائی میں دیر تک رلاتا تھا، ایک خیال۔۔۔۔ جس میں اس کی دو سالہ بیٹی کا چہرہ تھا اور ایک سوال تھا۔''(۶)

اس کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جتنا مرضی عیاش پرست ہو لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب وہ ان تمام تر عیاشیوں سے اکتا جاتا ہے اور پھر اس سے جڑے مخلص رشتوں سے کی گئی بے رخی اور زیادتیوں پر پچھتاتا ہے۔

افسانہ ''بے بی کیئر سینٹر'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں لوگ اپنے بچوں کو محفوظ ہاتھوں میں چھوڑ کر بے فکر ہو کر اپنی زندگی کے دیگر کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بی بی ہے۔ اس کا بے بی کیئر سینٹر بہت جلد مقبول ہو گیا جس میں وہ بچوں کی تربیت اور تحفظ کو ملحوظ رکھتی تھی۔

شروع میں اس میں موجود بچوں کی تعداد صرف آٹھ تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تعداد ۸۰ ہو گئی۔ یہ سب بی بی کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ بی بی کے لیے اکیلے اس سینٹر کو چلانا مشکل ہو گیا تھا اس لیے اس نے اسی میں موجود چھ بڑے بچوں کو ان چھوٹے بچوں کی نگرانی کے لیے منتخب کیا۔ اس سے اس کی تربیت کی جانچ بھی ہو جاتی۔ شروع میں نتائج بہت عمدہ رہے جو اس کی تربیت کا بہترین آئینہ دار تھے۔ پھر ڈے کیئر سینٹر میں کچھ نئے بچے جو گنتی کے چھ یا سات تھے داخل ہوئے۔ یہ بچے زور سے ہنستے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، کھیلتے کھیلتے تھکتے نہ تھے اور ایک دوسرے کو منہ چڑھاتے، کپڑے کھینچتے تھے۔

راتوں رات بی بی کے سینٹر کا ڈرا سہا تہذیب یافتہ ماحول زندگی کی چمکتی دمکتی فضائوں میں جھومنے لگا۔بی بی سمجھدار تھیں چند ہی لمحوں میں انھیں کئی سالوں کا نہ سمجھ آنے والا سبق سمجھ میں آگیا کہ بچوں پر لگائی جانے والی بے جا پابندیاں ان کی نشو ونما میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔بچوں کی پرورش کے لیے بے جا پابندیوں اور بندشوں سے آزاد فضادرکار ہوتی ہے یعنی ان ننھے پھولوں کو کھلنے کے لیے تازہ اور آزاد ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔

بلند اقبال نے ان کے علاوہ اور بھی کئی نئے اور منفرد موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ان کے افسانوں کے نام اتنے دلچسپ اور پُراسرار ہوتے ہیں کہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور ان کے افسانوں کے عنوان کی پراسراریت قارئین کے اندر تجسس پیدا کرتی ہے۔پر تجسس اور پُراسرار افسانے کا عنوان قاری کو ایک ہی نشست میں افسانہ ختم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

افسانہ ’’گدھ‘‘ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے کہ جس میں قحبہ خانہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور ’’رجو بائی‘‘اس گھنونے دھندے کو بڑی بے باکی سے چلاتی ہے۔ابتدا میں اس کا ذکر کچھ اس طرح ملتا ہے:

> ’’لے جا۔۔۔تاجا مال ہے۔ایک ایک بوٹی مجے دار۔۔۔،کراری اور خستہ۔۔۔دیکھ پیٹ دیکھ۔۔۔ہے نا سلگتا ہوا پٹاخہ۔۔۔سینہ دیکھ۔۔۔دانتوں میں پھنس جائیں ماں قسم ایسی بوٹیاں ہیں۔۔۔۔سو بوریوں میں ایک دانہ ایسا چوکس مل جائے۔اچھا۔۔۔تو ہی بول کیا دے گا۔کیا کہا۔۔۔سالے چھیچھڑے خریدنے آیا ہے کیا۔۔۔چل نکل یہاں سے۔۔۔‘‘ ۔۔۔۔
> رجو بائی نے گاہک کو ماں کی گالی دی اور بالا خانہ کا دروازہ ایسے زور سے بند کیا کہ چوکھٹ پر بجنے والی آواز گاہک کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔‘‘(۷)

تاریخ میں ہمیں اس طرح کے بہت سے کردار مل جاتے ہیں جو اشرافیہ کے لیے ایسے وسائل پیدا کرتے ہیں۔منٹو، رسوا اور دیگر کئی ادیبوں نے بھی طوائف کو موضوع بحث بنایا ہے۔رجو بائی نوجوان لڑکیوں کے جسم کی نمائش سے لوگوں کو متوجہ کرتی ہے اور پھر من مانی رقم بٹورتی ہے۔

انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ اب بھی معاشرے میں رجو بائی اور خانم جیسے کردار موجود ہیں، جو جسم فروشی کے اس ناپاک کاروبار کو اپنا ذریعہ معاش گردانتے ہیں اور آئندہ نسل کے لیے بہت برے اثرات چھوڑتے ہیں۔

افسانہ ''بھینٹ'' ایسے لوگوں کی دردناک داستان بیان کرتا ہے جو اپنی منت اور مراد کے لیے دیوی دیوتاؤں پر اپنے بچوں کی قربانی پیش کر دیا کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس قربانی سے ان کے دیوی دیوتا خوش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ یہ لوگ بھینٹ اور قربانی کے بھنور میں اس قدر پھنسے ہوئے تھے کہ معصوم اور چھوٹے بچوں کی صورت پر بھی رحم نہیں کرتے۔ یعنی اپنے چھوٹے اور معصوم بچوں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ ان دیوتائوں کے نام شاہ دولہ، مولک کا بت اور ٹونا تھ دیوتا وغیرہ تھے۔

شاہ دولہ کے پاس اکثر لوگ اولاد کی دعا کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے اور منتیں پوری ہو جانے کے بعد والدین کو پہلے بچے کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ شاہ دولہ کا انتقال ۱۰۷۵ء میں ہوا اور اس کا مزار گجرات میں ہے لیکن نو سو سال گزر جانے کے باوجود بھی ضعیف اعتقادات رکھنے والے والدین آج بھی اپنے پہلے بچے کو شاہ دولہ کے مزار پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس افسانے کا اختتامی حصہ پیش ہے جہاں شاہ دولہ کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اپنی منتیں پوری کرنے کے لیے قربانی دیتے تھے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مجمع پھر سے ڈھول بجانے لگا باجے زور زور سے بجنے لگے، تالیاں بھی پٹنے لگیں۔ ایک من چلا کہیں سے گلاب موتیوں کے ہار اٹھا لایا اور ناچتے شاہ دولہ کے گلے میں ڈال کر حق اللہ، حق اللہ کے نعرے لگانے لگا۔ سارا مجمع ناچنے لگا۔ ہو مرادیں پوری، ہو منتیں پوری... حق اللہ حق اللہ۔ اچانک پھر کوئی من چلا اپنی کھولی میں بھاگا اور تھالی میں کچھ گوشت کی بوٹیاں لے آیا اور شاہ دولہ سے منت کرنے لگا... ایک بوٹی کھالے۔ ایک بوٹی کھالے قربانی کی ہے۔''(۸)

ڈاکٹر بلند اقبال کا ''آدھا مرد'' اور خالد سہیل کا ''ہمزاد'' دونوں افسانوں میں تقریبا موضوع کے اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے۔

ان افسانوں میں موجود زیر بحث موضوع اس معاشرے کا المیہ بن چکا ہے یعنی یہ خیال کے مخالف جنس کے اثرات اس کی اصل پہچان کو کہیں دبا دیتے ہیں۔ جسم اور اس میں موجود روح میں تضاد پایا جاتا ہے۔ بلند اقبال کا آدھا مرد اسی المیے کا

جزو ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو ایک غلط لباس یعنی مخالف وجود کا حصہ مانتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ ایک فطری عمل ہے کہ مخالف جنس کی عادات اور ان جیسا بننے کی خواہش کرنا وغیرہ لیکن اپنے وجود سے بغاوت اس فطری عمل سے بغاوت ہے۔

افسانوی مجموعہ: ''میری اکیاون کہانیاں''

بلند اقبال کا یہ افسانوی مجموعہ ۵۱ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ان کے افسانوی مجموعے ''فرشتے کے آنسو'' کی بھی تمام کہانیاں شامل کرلی گئی ہیں۔

بلند اقبال روایتی انداز اور روایتی موضوعات سے بالکل ہٹ کر نئے اور منفرد موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد سہیل رقمطراز ہیں:

> ''جب بلند اقبال کے افسانے محفلوں میں پیش کیے جاتے ہیں تو ان پر ادبی اور فنی تنقید سے زیادہ سماجی، ثقافتی اور مذہبی تنقید ہوتی ہے۔ چونکہ وہ روایتی انداز سے روایتی موضوعات کے بارے میں نہیں لکھتے، اس لیے روایتی قارئین پریشان ہو جاتے ہیں۔ جہاں موضوعات (Theme) کے حوالے سے بلند کا منٹو سے تعلق ہے، ہیئت (Form) کے حوالے سے ان کا تعلق انور سجاد اور مظہر الاسلام جیسے جدید افسانہ نگاروں سے ہے جن سے محظوظ ہونے کے لیے قاری کو تخلیقی طور پر (Involve) ہونا پڑتا ہے۔''(۹)

افسانوی مجموعہ ''میری اکیاون کہانیاں'' کا تجزیاتی مطالعہ

افسانہ ''ید بیضا'' میں خواتین کی مظلومی اور استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں موسیٰ جو زینب سے محبت کرتا ہے۔ اصل میں یہ محبت کم اور ہوس زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ زینب کو صرف ایک معشوق کے طور پر شو پیس کی طرح رکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زینب کو اس کے علاوہ کوئی اور نہ دیکھے لیکن زینب اپنی شناخت کی تلاش اور شخصیت کا اظہار چاہتی ہے۔

آخر کار موسیٰ نے زینب کے منہ پر تیزاب پھینک دیا جس سے اس کا منہ جھلس گیا اور وہ بدصورت چہرہ ہزاروں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

تیزاب پھینکتے وقت اس کی ہتھیلی پر بھی تھوڑا سا تیزاب گرا جس سے نشان (ید بیضا) بن گیا۔ لوگوں کو جب اندازہ ہوا کہ یہ کام موسیٰ کا ہے تو اس کے کمرے کی جانب دوڑے۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر موسیٰ کو احساسِ ندامت ہوا اور اس بے خود کو بھیڑ کے حوالے کر دیا۔ بلند اقبال نے اس منظر کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

> "۔۔۔آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہی موسیٰ حیران ہو گیا اُسے یوں لگا جیسے زینب کو تیزاب میں جلا کر وہ خود بے شکل ہو کر فرعون کی شکل میں بدل گیا ہے جبکہ زینب کی شکل حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ہتھیلی کی صورت ید بیضا میں ڈھل گئی ہے۔۔۔ اور پھر موسیٰ نے حقارت سے اپنی ہتھیلی کے جلے ہوئے نشان کو دیکھا اور ہاتھ ہوا میں بلند کر کے خود کو غصیلے لوگوں کے حوالے کر دیا۔"(۱۰)

افسانہ "پھٹا ہوا دامن" فیشن کے نام پر عورت کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کہانی میں زرینہ ایک ماڈل ہے اور یوسف اس کا ڈیزائنر ہے۔ ریمپ بالکل سج گیا ہے جہاں ایک ایک کر کے ماڈل ڈریس کی نمائش کر رہی ہیں۔ جب زرینہ کی باری آتی ہے تو یوسف اس کے ڈریس میں سے کچھ جھالروں کو کم کر دیتا ہے۔ جس سے زرینہ کے حُسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور وہ ہر نظر کا مرکز بن جاتی ہے۔

ریمپ پر چلتے ہوئے زرینہ کے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو کر شائقین کے مجمعے میں جا گرتی ہے۔ زرینہ اس موقع پر ایک نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتی ہے جو اصل میں کہانی کا مرکزی نقطہ ہے۔ بلند اقبال نے اسے اس طرح پیش کیا ہے:

> "اسے یوں بھی لگا جیسے یہ فیشن شو دراصل لباس کے ایڈورٹائزمنٹ کی جگہ انسانی جسموں کی نمائش کا بازار ہے، شاید صدیوں پہلے کا بازارِ مصر، جہاں کبھی یوسف کو بیچا گیا تھا۔ اس عجیب و غریب خیال کے آتے ہی زرینہ کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل تاریخ کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے مگر۔۔۔ فیشن شو کے شائقین سمجھے جیسے زرینہ کا پاؤں اچانک اپنی

سینڈل کی ہیل میں پھنس گیا ہے اور وہ لاکھ چاہتے ہوئے اپنا بیلنس قائم نہیں رکھ پا رہی ہے اور بالآخر ریمپ سے قلابازیاں کھاتے ہوئے اُن کے درمیان گرتی چلی گئی۔''(۱۱)

اس افسانوی مجموعے کا ایک اہم افسانہ ''اُبال'' ہے جو اس کرب کی کہانی ہے جس کی وجہ سے انسان زندگی میں خوشحالی اور سکون کے لیے غیر ملک میں ڈیرے توڈال لیتا ہے لیکن وہ اطمینان جو ماضی میں ہوا کرتا تھا اسے صرف یاد ہی کرتا رہتا ہے۔ڈاکٹر بلند اقبال لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔چولہے پر دھری ایک چھوٹی سی دودھ کی دیگچی تھی جس میں بھرے ہوئے تازہ دودھ میں کبھی بھی اتنا اُبال نہ آپاتا تھا کہ دودھ کا ایک قطرہ بھی چھلک جاتا۔۔''(۱۲)

اس کہانی میں دودھ کو زندگی کے حالات سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اگر اس میں معمول سے ہٹ کر ذراسی بھی تبدیلی آ جائے تو زندگی کا توازن خراب ہو جاتا ہے جس طرح چولہے کی آنچ بڑھا دینے سے دودھ کو اُبال آ جاتا ہے۔

افسانہ ''کوڑے جو درد سے چیختے تھے'' ایک عورت کی کہانی ہے جسے زنا کے گناہ میں چالیس کوڑوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ کوڑوں کی ضربوں سے چاند بی بی بے حال ہو چکی ہے اور اس دوران تماشائیوں کے جوش و خروش میں بھی ذرا کمی آ گئی ہے۔

بلند اقبال یہاں ایک حساس نقطہ نکالتے ہیں کہ اب کوڑے خود درد سے چیخ رہے ہیں۔ کیونکہ جلاد جو کوڑے مار رہا تھا چاند بی بی کے نرم جسم سے ایک الگ ہی جنسی لذت محسوس کر رہا تھا جس کا احساس کوڑوں کو بھی ہو چکا تھا اور وہ احساسِ گناہ کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔اس احساس کو بلند اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں:

''کوڑوں کا بوجھ۔۔۔جو اس کے مارنے والے کی بے لگام جنسی لذت کی خواہش سے پیدا ہو رہا تھا اور چاند بی بی کے نرم و گداز بدن پر پڑنے والی ہر ایک ضرب سے اُس کے لیے جنسی تسکین کا مسلسل سبب بن رہا تھا۔بے بس کوڑے جو چاند بی بی کی طرح زنا کے مرتکب ہو گئے تھے۔وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے مارنے والے کو غلیظ گناہ میں برابر کے شریک تھے اور اب اپنے کرب کا سارا بوجھ ہوا پر ڈال کر اُسے ریزہ ریزہ کر رہے تھے۔''(۱۳)

ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں کے موضوعات کے تنوّع سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ و مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ جس طرح انھوں نے مشرق اور مغرب کی تہذیب کو قریب سے دیکھا اور زندگی کے بہت سے چیلنجز کو قبول کیا اسی طرح ان کی کہانیاں قاری کو غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کئی بار ان کی کہانیاں بہت سادہ ہوتی ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک اعلیٰ فکر ہوتی ہے۔ ماضی میں ایسے تجربے کم ہی ملتے ہیں۔ اس حوالے سے جاوید انور (وارانسی، انڈیا) لکھتے ہیں:

> ''بلند اقبال نے اپنے افسانوں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں سے بیشتر ایسے تجربے ہیں جو اس سے قبل بہت کم کیے گئے ہیں اور جس سے جدوجہد کرتے ہوئے یہ فنکار اپنے دور میں انھیں سر کرنے کی تلاش میں سر گرم ہے۔ ان نئے مسائل کا انسلاک زمینی، علاقائی، سیاسی، نفسیاتی اور بنی نوح انسان کے شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری مسائل سے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فردیت کے عجیب و غریب الجھتے ہوئے تصورات سے بھی ہے۔''(۱۴)

حواشی

۱۔ بلند اقبال، فرشتے کے آنسو (انڈیا: وارانسی تحریکِ ادب، ۲۰۱۰ء)،۸۔

۲۔ ایضاً، ص۱۰۔

۳۔ ایضاً، ص۷۔

۴۔ ایضاً، ص۹-۸۔

۵۔ ایضاً، ص۲۹-۲۸۔

۶۔ ایضاً، ص۴۰۔

۷۔ ایضاً، ص۸۷۔

۸۔ ایضاً، ص۸۶۔

۹۔ ایضاً، ص۹۔

۱۰۔ بلند اقبال، میری اکیاون کہانیاں (دہلی: عرشیہ پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء)۱۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص۲۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص۳۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص۴۳۔

۱۴۔ بلند اقبال، فرشتے کے آنسو، ص۱۰۔

باب ششم

روبینہ فیصل: شخصیت اور فن

اور

افسانوی مجموعہ ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' اور ''گمشدہ سائے''

کا تجزیاتی مطالعہ

تعارف:

روبینہ فیصل پاکستان کی ایک نامور مصنفہ ہیں۔روبینہ فیصل پاکستان کے شہر فیصل آباد (لائل پور) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کوہ نور گرامر ہائی سکول فیصل آباد سے ہوئی اور اس کے بعد ان کا خاندان ہمیشہ کے لیے لاہور منتقل ہو گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی، ہیلے کالج سے بیچلر آف کامرس کی ڈگری اس کے بعد فارمن کرسچن کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ماسٹر ڈگری مکمل کی۔روبینہ فیصل ایک کالم نگار، صحافی، شاعر،اسکرین رائٹر اور فلم ڈائریکٹر ہیں۔

روبینہ فیصل اپنی طالب علمی کی زندگی سے ہی اپنی تحریری صلاحیتوں کا اظہار کرنے کی خواہشمند تھیں اور وہاں وہ ہمیشہ کالج اور یونیورسٹی سطح کے فورمز میں حصہ لیتی تھیں۔ان کا باقاعدہ لکھنے کا دور اس وقت شروع ہوا جب وہ ایک ہفتہ وار اُردو اخبار میں شامل ہوئیں اور ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا۔روبینہ کا پہلا کالم جنرل ضیاء الحق پر شائع ہوا تھا جبکہ انھوں نے ضیاء کا موازنہ ذوالفقار علی بھٹو سے کیا تھا۔انھوں نے قارئین کو متوجہ کیا اور اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اس کالم میں انھوں نے لوگوں کو ان کے خیالات سے متفق ہونے پر زور نہیں دیا بلکہ انھوں نے لوگوں کو ایک جگہ فراہم کی کہ جو سوچنا پسند کرتے ہیں اور جن میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو سکتی ہے وہ فرق کو خود سے محسوس کر سکتے ہیں۔روبینہ شاعری بھی لکھتی ہیں لیکن بظاہر وہ خود کو شاعرہ نہیں مانتی اور کالم، مختصر کہانیاں، اسٹیج اور ٹی وی اسکرپٹ لکھنے میں زیادہ آرام محسوس کرتی ہیں۔مصنفہ ۲۰۰۰ء میں لاہور پاکستان سے کینیڈا ہجرت کر گئی تھیں اور وہ چار بچوں کی قابل فخر ماں ہیں۔وہ اس وقت اوک ویل اونٹاریو (کینیڈا) میں مقیم ہیں۔

روبینہ فیصل پاکستان کے ''نوائے وقت'' کے لیے ہفتہ وار کئی سیاسی کالم لکھ چکی ہیں۔ان کی پہلی کتاب شائع شدہ کالموں کی ایک تالیف جو ۲۰۱۰ء میں ''روٹی کھاتی مورتیاں'' شائع ہوئی۔اس دوران وہ مختصر کہانیاں لکھتی رہیں اور کئی ادبی محفلوں میں پیش کرتی رہیں۔ مارچ ۲۰۱۶ء میں مصنفہ کی مختصر کہانیوں کی دوسری اشاعت، خواب سے لپٹی کہانیاں ریلیز ہوئی۔ان مختصر کہانیوں میں مذہب، سماجی، ثقافت اور گھریلو مسائل کے تنازعات کو دکھایا گیا ہے ان کی آزاد نظم شاعری کا ایک مجموعہ ۲۰۱۸ء میں ''ایسا ضروری تو نہیں'' کے نام سے جاری کیا گیا اور ان کی مختصر کہانیوں کی ایک اور کتاب ''گمشُدہ سائے'' ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی۔اس سال ۲۰۲۳ء میں روبینہ نے اپنا پہلا ناول ''نارسائی'' شائع کیا ہے۔روبینہ فیصل

۲۰۱۶ء میں ان کی کتاب ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' کے لیے ''خالد احمد ایوارڈ'' وصول کر چکی ہیں۔ ان کا ''دستک'' کے عنوان سے مقامی چینل میں ٹاک شو بھی کمیونٹی میں مقبول عام ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل روبینہ فیصل کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''پچھلے چند سالوں میں اردو کی خواتین لکھاریوں کی محفل میں ایک نئی لکھاری کا اضافہ ہوا ہے جس کا نام روبینہ فیصل ہے۔''(۱)

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران کے خیال میں:

''روبینہ فیصل کی کہانیاں ایک حساس اور باشعور خاتون کی داخلی خود کلامی کی آئینہ دار ہیں، حساسیت اور شعور کا امتزاج دکھ کا نہ ختم ہونے والا سفر ہے، ان کہانیاں میں شکستہ خوابوں کی وہ کرچیاں ہیں جو آنکھوں کو لہو رنگ کر دیتی ہیں۔''(۲)

روبینہ فیصل نے اپنی کیانیوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''میں نے جو دیکھا جو محسوس کیا جسے برداشت کیا، وہی لکھا ہے، درحقیقت یہ انسان کی اندر کی کہانیاں ہیں۔ پاکستان اور کینیڈا میں بکھری اپنے ہی لوگوں کی کہانیاں اکٹھی کیں اور اس سفر میں میری اپنی ذات کو درپیش سفر بھی شامل ہے۔ ان کہانیوں میں محبت ہے، ڈھیروں خواب ہیں، جدائی ہے، بے وفائی ہے اور وقت کی ستم ظریفی ہے۔ میں نے بغیر ڈرے بغیر دبے بولڈ موضوعات کو چنا ہے۔ میں نے کینیڈا کے سوشل ایشوز کو ہائی لائیٹ کیا ہے۔ پاکستان نے اقوامِ عالم میں دیگر ممالک کے برعکس اپنے تشخص کو بلند کرنے کے لئے کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں کئے، اسی لئے ہمیں خود ہی اپنا سفیر بن کر پاکستان کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے اِس کے روشن پہلو کو اجاگر کرنا ہے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر بہادری سے جینے کا ہنر مجھ میں میری امی کی طرف سے آیا ہے۔''(۳)

تصانیف:

کالموں کے مجموعے:

روٹی کھاتی مورتیاں (۲۰۱۰ء)

افسانے:

۱۔ خواب سے لپٹی کہانیاں (۲۰۱۶ء)

۲۔ گمشدہ سائے (۲۰۱۹ء)

شاعری:

ایسا ضروری تو نہیں (۲۰۱۸ء)

ناول:

نارسائی (۲۰۱۹ء)

افسانوی مجموعہ ”خواب سے لپٹی کہانیاں“ کا تجزیاتی مطالعہ

روبینہ فیصل کے اس افسانوی مجموعے میں کل ۱۸ افسانے شامل ہیں۔ روبینہ فیصل اس کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

> ”خواب سے لپٹی کہانیاں“ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان میں محبت ہے، ڈھیروں خواب ہیں، موت ہے، جدائی ہے، بے وفائی ہے اور وقت کی ستم ظریفی ہے۔ یہ موضوع نئے نہیں ہیں لیکن حالات اور کردار نئے ہونے کی وجہ سے، مجھے ہر کہانی نئی لگی ہے۔ میں ڈر کر یا دب کر یا ڈپلومیسی سے نہیں لکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے حساس اور بولڈ موضوعات کو بھی چنا ہے، میں نے ایسی باتوں کے مقام پر جا کر بھی دیکھا ہے جہاں جانے سے عام انسانوں کے پر جلتے ہیں۔“(۴)

خالد شریف ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' پر اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

''روبینہ فیصل کی کہانیوں میں پاکستان کے دیہات کی سوندھی مٹی کی خوشبو اور کینیڈا کی برفانی رُت کی بوقلمونیاں ایک ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ وہ رہتی وہاں ہیں مگر ان کی روح یہیں کہیں کسی پنگھٹ، کسی سرسوں کے کھیت یا کچی پکی پگڈنڈیوں کے ارد گرد محوِ خرام ہے۔ ان تمام کہانیوں میں دونوں معاشرتوں کے تقابلی مطالعے نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ روبینہ کی فنی مہارت کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا''(۵)

روبینہ فیصل کا افسانہ ''محبت کی آخری کہانی'' کا موضوع مرد عورت کی دوستی، تعلق اور محبت ہے۔ وہ محبت جو بہت سی آزمائشوں اور قربانیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ بہت سے نفسیاتی مسائل اور سماجی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ بہت سے دل ٹوٹ جاتے ہیں ذہن پریشان ہو جاتے ہیں، من بھاری ہو جاتے ہیں، انائیں زخمی ہو جاتی ہیں، روحیں لہولہان ہو جاتی ہیں مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں پھر دور ہو جاتے ہیں پھر قریب آتے ہیں پھر دور ہو جاتے ہیں۔ کچھ گتھیاں الجھ جاتی ہیں اور کچھ گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ قربتوں اور دوریوں محبتوں اور اذیتوں کا یہ سفر ساری عمر جاری رہتا ہے۔

روبینہ فیصل کا افسانہ ''حلال بیوی'' ایک طرف تو ہمیں ظاہر اور باطن میں فرق سمجھاتا ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کو بے نقاب کرتا ہے جو اپنے آپ کو بظاہر اسلام کے پیروکار ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس اُوور کورٹ کے پیچھے ہوس، مطلب اور شیطانی خواہشات چھپی ہوتی ہیں۔

روبینہ فیصل کا بے باک قلم معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معاشرے کے معصوم لوگ کیسے مطلب پرست لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اس راز کو روبینہ فیصل نے انتہائی خوش اسلوبی سے بیان کیا۔

افسانوی مجموعہ ''گمشدہ سائے'' کا تجزیاتی مطالعہ

خالد سہیل ''گمشدہ سائے'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''روبینہ فیصل اپنے افسانوں کے نئے مجموعے۔ گم شدہ سائے۔ میں اپنے نسوانی کرداروں کے حوالے سے ہمیں بتاتی ہیں کہ ایک عورت اپنے دل کے نہاں خانوں میں کون

سی خواہش، کون سی آس، کون سی امید، کون سی آرزو، کون سا خواب اور کون سا آدرش چھپائے رکھتی ہے۔ وہ اپنے جذبات اور خیالات کا کھل کر اظہار کیوں نہیں کرتی اور اگر کسی مرد سے اس کا اظہار کرتی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔"(٦)

روبینہ فیصل کا افسانہ "ایک ڈائری" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو بظاہر خوش لیکن اندر سے دکھی ہے۔ وہ ساری عمر اپنے دل کا راز چھپائے رکھتی ہے جو اسے اندر سے دیمک کی طرح کھاتا رہتا ہے اور اسے جذباتی طور پر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ اپنا راز اپنی ڈائری سے شیئر کرتی ہے اور جب اس کے مرنے کے بعد اس کی ڈائری اس کی سہیلی کو ملتی ہے تو اس پر محبت کا راز افشاں ہوتا ہے۔ وہ محبت جو ایک سراب اور ایک عذاب سے کم نہ تھی۔ اس بارے میں ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں:

"روبینہ کے افسانوں کے نسوانی کردار محبت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے محبت ایک سراب کی طرح ہے۔ وہ جتنا اس کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ سراب اتنا ہی دور ہوتا جاتا ہے۔ محبت کو نہ پانا اور پا کر کھو دینا ان کی ذات اور زندگی کا المیہ بن جاتے ہیں۔"(٧)

روبینہ فیصل کا افسانہ "فینکس" تین عورتوں کی محبتوں کہانی ہے۔ پہلی عورت کی محبت یک طرفہ ہے۔ دوسری عورت کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی محبت جھوٹی محبت ہے اور وہ پہلی عورت سے کہتی ہے کہ یک طرفہ محبت کا ماتم نہ کر۔ تیسری عورت نے اپنی محبت سے شادی کر لی لیکن پھر اس کے محبت کے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کی بجائے چکنا چور ہو گئے۔ اس نے باقی دو عورتوں سے کہا چپ کرو کم بختو! تم دونوں ہی فضول کہانیاں سناتی ہو۔ ایک بدبخت اس محبوب کو بیٹھی رو رہی ہے جس نے اس سے محبت کی ہی نہیں اور دوسری اس دھوکے کو رو رہی ہے جو خود کھانے سے پہلے کسی اور کو دے چکی تھی۔ یہ بھی کوئی دکھ ہیں؟ دکھ تو میرا ہے جو اتنا معتبر ہے کہ اس قلم سے نکلتا ہی نہیں۔

روبینہ فیصل کا افسانہ جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا "پاک سرزمین" ہے۔ یہ افسانہ اصل میں موجودہ دور کی انتہائی خوفناک تصویر ہے جس میں کچھ لوگ جو مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں حقیقت میں درندے ہیں۔ معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ شریف لوگ ایسے لوگوں کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں۔ یاسمین اور مولوی صاحب کے ناجائز تعلقات کو چھپانے کے لیے مولوی محلے والوں کے اعتماد کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے اور ایک شریف انسان کی جان لے لیتا ہے۔

روبینہ فیصل کے افسانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حقیقت نگار اور نڈر خاتون ہیں۔انھوں نے معاشرے کے مظلوم اور بے بس لوگوں کو موضوع بنایا ہے خاص طور پر خواتین کے مسائل کو لوگوں کے سامنے آسان اور کھلے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ان کے افسانوں کے مجموعے ''گمشدہ سائے'' کے بارے میں امجد اسلام امجد رقمطراز ہیں:

''روبینہ فیصل کی کہانیوں کی پہلی کتاب کی اشاعت پر بھی میں نے ان کی کہانیوں کے موضوعات کے مشاہدے اور انداز تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مستقبل میں ان سے اس سے بھی بہتر کی توقع ہے سو سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ نہ صرف یہ توقع پوری ہوئی بلکہ اس کہانی کار کے کچھ ایسے جوہر بھی کھلے جو اس سے قبل بہت زیادہ نمایاں نہیں تھے۔وطن اور ادبی مراکز سے دوری کے باوجود روبینہ نے جس طرح سے اپنی مہکی ہوئی دنیا کے مانوس اور کچھ کینیڈا کے شب و روز سے مخصوص گوشوں کو دیکھا اور دکھایا ہے وہ بلاشبہ داد تحسین اور گہرے مطالعے کے لائق اور حقدار ہیں کہ ان میں دو مختلف دنیائیں ایک ہی ناظر کے مشاہدے اور تجربے سے اس طرح سے گزری ہیں کہ قاری اپنے آپ کو منظروں میں شامل پاتا ہے۔زندگی کے پیچیدہ اور پر اسرار عمل کو ممکنہ حد تک سمجھنے میں روبینہ فیصل کی یہ کہانیاں یقیناً ایک گائیڈ کا درجہ رکھتی ہیں۔''(۸)

ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی لکھتے ہیں:

''پتہ نہیں کیوں مجھے ''گم شدہ'' کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔جیسے کوئی گمشدہ خواہش تمنا یا آرزو،جب کوئی گمشدہ چیز،خواہش یا دوست اچانک مل جائے تو اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔''گمشدہ سائے'' روبینہ فیصل کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے،روبینہ فیصل ایک مختلف اور ممتاز افسانہ نگار ہے بلکہ میں اسے ایک گمشدہ افسانہ نگار کہوں گا جسے اردو ادب نے تلاش کر لیا۔''گمشدہ سائے'' کہ ہر افسانے میں ایک نامعلوم کھوئی کھوئی سی گمشدہ کیفیت قاری کو مطالعے کے سائے میں ستانے پر مجبور کرتی ہے،یہی ''گمشدگی'' کی کیفیت غم زدگی میں بدل جاتی ہے۔گمشدہ سائے کا قاری کسی ایسی کیفیت میں الجھ جاتا ہے جس میں سایوں کا جرمٹ تو ہے لیکن چھاؤں نہیں ہے۔''(۹)

سید حسین حیدر کا کہنا ہے:

''روبینہ کے افسانوں کی دوسری کتاب ''گمشدہ سائے'' نے اردو ادب میں ان کی ایک باصلاحیت مصنف کی حیثیت مستحکم کر دی ہے۔ پہلی کتاب ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' میں انھوں نے یہ کہہ کر جس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ہاں!! اب کہانی لکھی جائے گی تو یہ کتاب اس عزم کا دوسرا پڑاؤ ہے۔ ان کی زیر نظر نثری تخلیق کا چند الفاظ میں پوری طرح احاطہ کرنا مشکل ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس تصنیف میں ایک سے ایک دل پر اثر کرنے والا افسانہ، روح کو جھنجوڑ دینے والی کہانی یہ سب بڑی فنی مہارت سے لکھی گئی ہیں۔ کالم نگاری کی بدولت ان کے مشاہدے کی جو وسعت ہے وہ ان کو اور افسانہ نگاروں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ کردار ہو، پلاٹ ہو، کسی واقع کا تجربہ یا تاثر ہو اس کو یہ ایک لڑی میں پرو کر جس منظم طریقے سے نثر میں منتقل کرتی ہیں اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ اس کے علاوہ جس خوبی سے یہ موجودہ دور کے نفسیاتی، سماجی اور تمدنی مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں اور اس میں جو سچائی اور حقیقت نگاری ہوتی ہے وہ ان کے افسانوں کے تاثر کو دوبالا کر دیتی ہے پھر بیانیے کا سادہ، فطری اور برجستہ لب و لہجہ قاری کی دلچسپی کو کسی مرحلے پر کم نہیں ہونے دیتا۔ اس کامیاب نثری تخلیق پر مصنفہ کو بہت بہت مبارک باد۔''(۱۰)

کچھ لوگ روبینہ فیصل کو مذہب سے باغی تصور کرتے ہوں گے لیکن جو مسائل انھوں نے اپنے افسانوں میں بیان کیے ہیں ایک بار پھر سے منٹو کا عکس نظر آتا ہے جو ایک حقیقت پسند اور غریب دوست ادیب تھا۔

حواشی

۱۔خالد سہیل،ڈاکٹر،”روبینہ فیصل کے افسانے،عورت اور محبت،“

https://www.humsub.com.pk/295009/khalid-sohail-274/

۲۔فیصل فارانی،”روبینہ فیصل کی خواب سے لپٹی کہانیاں۔۔۔۔“،https://www.mukaalma.com/54037/

۳۔ایضاً،https://www.mukaalma.com/54037/

۴۔روبینہ فیصل،خواب سے لپٹی کہانیاں(لاہور:ماورا پبلیکیشنز،۲۰۱۶ء)،۱۰۔

۵۔فیصل فارانی،”روبینہ فیصل کی خواب سے لپٹی کہانیاں۔۔۔۔“،https://www.mukaalma.com/54037/

۶۔خالد سہیل،ڈاکٹر،”روبینہ فیصل کے افسانے،عورت اور

محبت،“https://www.humsub.com.pk/295009/khalid-sohail-274/

۷۔ایضاً https://www.humsub.com.pk/295009/khalid-sohail-274/

۸۔روبینہ فیصل،گمشدہ سائے(لاہور:قلم فاؤنڈیشن انٹر نیشنل،۲۰۱۹ء)،۱۳۔

۹۔ایضاً ص ۱۴۔

۱۰۔ایضاً،ص ۲۲۔

کتابیات

۱۔ افتخار عارف۔ ''پیش لفظ''، مشمولہ، بیرونِ ممالک میں اردو۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۶ء۔

۲۔ بلند اقبال۔فرشتے کے آنسو۔انڈیا: وارانسی تحریکِ ادب، ۲۰۱۰ء۔

۳۔ بلند اقبال۔میری اکیاون کہانیاں۔دہلی: عرشیہ پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ حامد بیگ، مرزا۔اُردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء۔ ۱۹۰۹ء۔دہلی: عالمی میڈیا پرائیویٹ لیمٹیڈ، ۲۰۱۴ء۔

۵۔ حامد یزدانی، سیّد۔خالی بالٹی اور دوسرے افسانے۔لاہور: سانجھ پبلیکیشیز، ۲۰۲۲ء۔

۶۔ خالد سہیل، ڈاکٹر۔دیوتا۔لاہور: سانجھ پبلیکیشنز، ۲۰۲۱ء۔

۷۔ روبینہ فیصل۔خواب سے لپٹی کہانیاں۔لاہور: ماورا پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء۔

۸۔ روبینہ فیصل۔گمشدہ سائے۔لاہور: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹ء۔

۹۔ راجندر سنگھ بیدی۔افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل، مشمولہ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ، گوپی چند نارنگ۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء۔

۱۰۔ شفیق انجم، ڈاکٹر۔اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں۔اسلام آباد: پورپ اکادمی، ۲۰۰۸ء۔

۱۱۔ عطاءالرحمٰن نوری۔اردو اصناف ادب۔مہاراشٹر: رحمانی پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء۔

۱۲۔ فرمان فتح پوری۔اردو نثر کا فنی ارتقا۔نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء۔

۱۳۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ادبی اصناف۔گجرات: اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء۔

۱۴۔ لطیف الدین احمد ساقی۔فن مختصر افسانہ۔لاہور، ۱۹۳۸ء۔

۱۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر۔اُردو افسانہ روایت و مسائل۔نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔

ویب گاہیں

۱۔وکیپیڈیا،"افسانہ"(تاریخ رسائی:۱۸اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%A7%D9%81%D8%B3%D8%A7%D9%86%DB%81

۲۔احمد علی جوہر،ڈاکٹر،"صنف افسانہ اور اس کا آغاز وارتقا،"(تاریخ رسائی:۱۰اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://adbimiras.com/sinf-e-afsana-aur-uska-aaghaz-wa-irteqa-dr-ahmad-ali-jauhar/

۳۔روبینہ فیصل،"اُردو ادب اور کینیڈا میں اُردو افسانہ،"(تاریخ رسائی:۱۱اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://www.humsub.com.pk/339693/rubina-faisal-45/#lnm2jz99rwvjjywkgs

۴۔وکیپیڈیا،"کینیڈا میں اردو،"(تاریخ رسائی:۱۱اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://ur.wikipedia.org/wiki/%DA%A9%DB%8C%D9%86%DB%8C%DA%88%D8%A7_%D9%85%DB%8C%DA%BA_%D8%A7%D8%B1%D8%AF%D9%88

۵۔روبینہ فیصل،"پاکستانی اور کینیڈین مصنفین کے ادبی روابط،"(تاریخ رسائی:۱۱اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://www.mukaalma.com/132216/

۶۔خالد سہیل،ڈاکٹر،"روبینہ فیصل کے افسانے،عورت اور محبت،"(تاریخ رسائی:۱۳اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://www.humsub.com.pk/295009/khalid-sohail-274/

۷۔فیصل فارانی،"روبینہ فیصل کی خواب سے لپٹی کہانیاں۔۔۔،"(تاریخ رسائی:۱۶اکتوبر،۲۰۲۳ء)

https://www.mukaalma.com/54037/

رسائل

۱۔ طفیل احمد۔ ''اکیسویں صدی میں اردو فسانہ'' اردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۲۶ (اپریل-جون ۲۰۲۱ء): ۱۷۴۔

۲۔ زاہد حسن، '' کہانی کی آنکھ سے دیکھی گئی کہانیاں،'' بیاض گروپ آف پبلیکیشنز ۳۱، شمارہ ۹ (ستمبر ۲۰۲۳ء): ص ۴۲